بلوچ اور اُن کا وطن
CABOOL
Afghanistan
BALUCHISTAN
فاروق بلوچ

بلوچ اور اُن کا وطن

فاروق بلوچ

فکشن ہاؤس
لاہور • حیدرآباد • کراچی •

نام کتاب : بلوچ اور اُن کا وطن
مصنف : فاروق بلوچ
اہتمام : ظہور احمد خاں
پبلشرز : فکشن ہاؤس لاہور
کمپوزنگ : فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز : سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور
سرورق : ریاض ظہور
اشاعت اول : 2012ء
اشاعت دوم : 2016ء
قیمت : -/300 روپے

تقسیم کنندہ:
فکشن ہاؤس: بک سٹریٹ 68- مزنگ روڈ لاہور، فون: 042-37249218-37237430
فکشن ہاؤس: 52,53 رابعہ سکوائر حیدر چوک حیدر آباد، فون: 022-2780608
فکشن ہاؤس: نوشین سنٹر، فرسٹ فلور دوکان نمبر 5 اردو بازار کراچی، فون: 021-32603056

فکشن ہاؤس
● لاہور ● حیدر آباد ● کراچی
e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

انتساب

بلوچ قوم کے نام

جو بلا شبہ دنیا کی سب سے قدیم ثقافت کا وارث

اور اپنے وطن کا حقیقی باشندہ ھے

Scanned by CamScanner

فہرست

عرضِ مصنف

زیرِ نظر کتاب "بلوچ اور ان کا وطن" بلوچ قوم کے بارے میں ایک تحقیقی کاوش ہے بلوچ قوم کے بارے میں بہت سا تحریری مواد اس سے قبل بھی دستیاب تھا اور ہے جن میں اس قوم کے بارے میں ہر طرح کی طبع آزمائی کی گئی ہے، یونانی ،عرب، ایرانی، روسی، برطانوی، افغان اور بلوچ موؑرخین اور محققین نے اس ضمن میں اپنے اپنے نظریات پیش کئے ہیں اور انھوں نے اپنی تحریروں میں بلوچوں کا شجرہ ،نسلوں کے مختلف گروہوں مثلاً ایرانی، ہندی، ترکمان، کرغز ،عرب، شامی اور کلدانیوں سے ملانے کی کوشش کی ہے لیکن کسی مورخ نے یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ بلوچ کہیں باہر سے آنے والے مہاجر نہیں ہیں اور نہ ہی نسلوں کے کسی خاص گروہ سے بنیادی تعلق رکھتا ہے کسی بھی مورخ یا محقق نے اس سرزمین کی مٹی سے ان کا تعلق نہیں جوڑا، جہاں وہ تاریخ سے بھی قبل کے زمانے سے آباد رہتے چلے آرہے ہیں۔ بلکہ ہر مورخ نے دوسرے مورخ سے اختلاف رکھتے ہوئے کوئی نیا نظریہ قائم کیا جو بذاتِ خود حقائق سے ہٹ کر ہے۔ اکثر موؑرخین نے بلوچ قوم کا شجرہ بڑے ہی اونچے، اعلیٰ اور شاہی خاندانوں سے ملانے کی کوشش کی ہے۔ ان خاندانوں مثلاً آلِ اسماعیل، عظیم آرین، قدیم کلدانی یا کسی اور اعلیٰ خاندان سے شجرہ کو نسبت دینا دراصل انسان کا احساسِ تفاخر ہے اور یہ انسان کی ایک کمزوری ہے کہ وہ اپنا تعلق اور اپنی نسبت ہمیشہ وہاں جا کر ملاتا ہے جہاں ماضی میں زریں کارناموں کی بھرمار ہوتی ہے اور اپنی

موجودہ کمزوریاں چھپانے یا اپنے سوئے ہوئے ضمیر کو جگانے یا مطمئن کرنے کی غرض سے
اپنے آباؤ واجداد کو ہمیشہ رومانوی اور دیو مالائی کرداروں کے روپ میں پیش کرتا ہے اور
انہی خیالات سے اپنے آپ کو تسکین دیتا ہے۔ اس سے انسان کا جذبہ و احساس تفاخر تو پورا
ہو جاتا ہے لیکن اس عمل سے تاریخ کس حد تک مسخ ہو جاتی ہے اسکا اندازہ شاید ان حضرات
کو نہیں ہوتا۔

بلوچوں کا تعلق کسی شاہی خاندان سے نہیں ہے اور نہ ہی فاتحین کی کسی قوم سے وہ نسبت رکھتے ہیں بلکہ وہ صحراؤں، پہاڑوں اور پہاڑی وادیوں میں رہنے والی ایک قدیم قوم ہے جو آریا حملہ آوروں سے بھی قبل ہندوستان اور ایران کی درمیانی سرزمین پر آباد رہتے چلے آرہے ہیں اور مختلف ناموں سے منسوب وسیع علاقوں میں قبائلی تحفظات اور اتحادیے کی صورت میں زندگی گذارتے چلے آرہے ہیں یہ قبائلی تحفظات پر قائم اتحادیے بسا اوقات بیرونی حملہ آوروں کے ہاتھوں تباہ ہوتے رہے اور ٹوٹتے رہے مگر جوں جوں حالات معمول پر آتے رہے یہ اتحادیے دوبارہ قائم ہو جاتے ہر بیرونی حملہ آور نے بلوچستان کے قدیم تہذیب کو متاثر کیا لیکن کسی بھی فاتح کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ وہ یہاں ٹک کر اور آرام کیساتھ حکومت کرتا۔ تاریخ کے اوراق اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ بلوچ قبائل نے ہر حملہ آور قوت سائرس اعظم ایرانی، سکندر اعظم یونانی، ساسانی، عرب، ہندی، منگول، غزنوی، آل بویہ اور برطانوی حتیٰ کہ ہر بیرونی حملہ آور سے اپنے خطے کی حفاظت کرتا چلا آرہا ہے۔

رند و لاشار بلوچ قبائل نے بھی ماضی قریب میں اس بلوچ قبائلی اتحادیے کو قائم کرنے کی کوشش کی اور قلات کے میروانی (کمبرانی) بھی یہی کوشش کرتے رہے۔ رند و لاشار بلوچ قبائل تو آپس کی خونی چپقلش اور طویل خانہ جنگی کی وجہ سے کوئی مرکزیت قائم کرنے میں ناکام ہو گئے البتہ قلات کے کمبرانی بلوچوں نے طویل جدوجہد کے بعد آخر کار ایک

طویل وعریض جغرافیہ کو کہ جس میں تمام تر آبادی مختلف بلوچ قبائل کی تھی، اپنی حکومت میں شامل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ میر نصیر خان اعظم 1749ء تا 1794ء نے اس تمام علاقے کو جو ماضی سے بلوچوں کا وطن رہتا چلا آرہا تھا اپنی قائم کردہ سلطنت میں شامل کر لیا ماسوائے ہیرکانی علاقہ (کوہ البرز اور بحیرہ خزر) سے متصل علاقے کے کیونکہ اولاً وہ علاقے مرکز یعنی قلات سے بہت ہی زیادہ فاصلے پر تھے اور دوئم نصیر خان کے پاس وسائل کی کمی تھی کہ جسکی بدولت بحیرہ خزر سے متصل علاقوں کو تصرف میں لاکر بلوچ وطن کی تکمیل کی جاتی۔ البتہ مشرق میں کچھی اور ہڑندو داجل سمیت کوہ سلیمان کا سارا علاقہ مرکز قلات کے تحت متحد ہو چکا تھا جبکہ مغرب میں اسکی حدیں کرمان اور بیرجند تک پہنچی ہوئی تھیں۔ شمالاً، جنوباً یہ دریائے ہلمند سے بحیرہ بلوچ (ساحل مکران) تک پھیلا ہوا تھا۔

ساسانیوں سے لیکر منگول حملوں تک بلوچ قبائلی نظام شدید متاثر ہوا اور بلوچ آبادیوں کو ان یلغاروں سے سخت نقصانات کا سامنا کرنا پڑا۔ بلوچ قبائل انتہائی کسمپرسی اور منتشر حالت میں اپنے ہی خطے کے اندر سرگرداں و پریشان صحرانوردی اور مہم جوئی کرتے رہے یہی وجہ ہے کہ مؤرخین نے تہذیب کے ان اولین طور پر باقاعدہ آباد ہونے والے قبائل کو خانہ بدوش، آوارہ گرد، صحرانورد، بدو، بادیہ نشین اور پہاڑی وغیرہ کے القاب دیئے۔ ماضی کے مؤرخین نے بھی حملہ آوروں کے مظالم کو برا بھلا نہیں کہا بلکہ الزام اور گالیاں بھی یہیں کے قدیم باشندوں کو دی۔ ایران میں بعدازاں بھی بلوچ مزاحمت جاری وساری رہی اور قومی وثقافتی بقا کی خاطر بلوچ قبائل طویل مزاحمتی تاریخ رقم کرتے رہے البتہ اس کے بعد مکمل مرکزیت قلات منتقل ہو گئی۔ 1410ء میں کمبرانی بلوچوں نے قلات میں منگول عہد کے اختتام پر اپنی حکومت کا آغاز کیا جو کمبرانی بلوچ قبیلے کی دو ذیلی شاخوں یعنی میروانی اور احمد زئی قبائل میں منتقل ہوا، 1948ء میں اختتام پذیر ہوا اور نوزائیدہ پاکستان کے ساتھ ملحق کر دیا گیا۔

علم تاریخ و سیاسیات سے شغف و دلچسپی رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ برطانوی سامراج نے اس خطے پر کسی نیک نیت کی وجہ سے قبضہ نہیں کیا تھا بلکہ ان کے اقدامات توسیع پسندانہ تھے۔ برطانوی اہلکاروں نے جس بے دردی کیساتھ بلوچ تاریخ کو مسخ کر ڈالا اسکی نظیر نہیں ملتی اور ان کے بعد ہمارے مقامی مؤرخین نے جب بلوچ قوم کی اصلیت اور اسکے جغرافیہ پر طبع آزمائی شروع کی تو انھوں نے ان ہی برطانوی مواد کو سامنے رکھا جو اس سے قبل تحریر ہو کر زبان زد خاص و عام آچکا تھا۔ اب برطانوی یا مغربی مکتبہ فکر بھی اگر کسی ایک نقطے یا نظریے پر متفق ہوتی تو پھر بھی شاید کوئی نہ کوئی نتیجہ نکل آتا اور یہ بحث کہیں نہ کہیں جا کر اختتام پذیر ہو جاتا۔ لیکن ان شاطروں نے بلوچ تاریخ پر جتنے بھی نظریات پیش کئے سب میں آپس میں اختلاف ہے۔ کوئی انھیں مشرقی باشندے لکھتا ہے تو کوئی انھیں مغربی بعض انھیں جنوبی خطے کے باشندے رقم کرتے ہیں اور بعض انھیں شمالی حملہ آوروں کی باقیات بتاتے ہیں۔ بہر حال ان قبضہ گیروں نے جس حد تک ممکن ہو سکا بلوچ تاریخ کو مسخ کر ڈالا اور بعد ازاں مقامی مؤرخین (جو باقاعدہ علم تاریخ کے طالب علم نہیں رہے اور نہ کبھی علم تاریخ کو باقاعدہ علمی طور پر پڑھا) ان ہی مواد کو سامنے رکھ کر ہر ایک نے ایک مکتبہ فکر کے برطانوی یا دیگر غیر ملکی مؤرخین کے نظریات کی پیروی کی۔ اس طرح بذات خود مقامی مؤرخین خصوصاً بلوچ مؤرخین میں شدید نظریاتی اختلافات پیدا ہو گئے مستقبل کے مورخ کے لئے مسائل اور مشکلات اتنی زیادہ ہیں کہ اسے اگر بلوچ قوم کے ماضی بعید پر حقیقی معلومات تلاش کرنے ہوں تو اسے ماضی کی کئی تہذیبوں کو کنگالنا پڑتا ہے۔

فاتح اقوام اپنے مفتوحین کی جو تاریخ رقم کرتے ہیں اس میں اپنے مفتوحین کی تباہی کا سارا سامان ڈال دیتے ہیں۔ فاتحین کا پہلا ہتھیار Divide and Rule یعنی مفتوح اقوام کی تقسیم اور ان پر حکومت کرنا ہے لہٰذا انگریزوں نے بھی اس خطے میں آتے ہی بلوچوں

کو دو حصوں میں تقسیم کرنے اور ہر حصے کو الگ قومیت بنانے کی مذموم کوشش کی یعنی بلوچ اور براہوئی۔ ماضی میں یہی تاریخی جبر عرب اور ایرانی اقوام نے بلوچوں کے ساتھ کیا تھا جنہوں نے بلوچوں کو کوچ و بلوچ میں تقسیم کرنے کی کوشش کی تھی اور اپنی تحریروں میں بھی انھیں الگ الگ قومیت لکھتے ہیں۔ ماضی بعید میں یونانیوں نے انھیں ان کی قومیت کی بجائے شہریت اور قبائلی ناموں سے تحریر کیا اور انھیں جس علاقے میں دیکھا اسی علاقے کے یونانی نام میں مزید ایک "ئی" کا سابقہ لگا کر اسے اسکی قومیت ظاہر کر دی، مثلاً گیدروشیا سے گیدروشیائی باشندے اور کچھ قبائلی نام مثلاً ناہروئی اور بلدائی (بلیدی) وغیرہ لکھنے پر اکتفا کیا ہے اور انھیں ایرانی صحرا سے لیکر دریائے سندھ تک آباد ظاہر کیا اور اس جغرافیے میں ان کے کثیر آبادی کے تذکرے پر تمام مؤرخین متفق ہیں۔

بہر حال وقت کا پہیہ گھومتا رہا اور بلوچ پھر ایک مرکز کے گرد جمع ہوئے اور اپنی بہادری اور سطوت کے نشان کرمان، قندھار، بندر عباس، مشہد، پنجاب اور دھلی تک نقش کیے اور 538 سال کی حکمرانی کے بعد آخر اپنی زندگی میں اسکی تکمیل نہ کر سکے۔ روہ ایسے مغلوب ہوئے کہ نہ صرف ان کی قومی وحدت تقسیم ہوئی بلکہ جغرافیائی اور سیاسی طور پر ان کی عظیم الشان خطہ زمین کے حصے بخرے کر دیئے گئے۔ اور موجودہ دور میں ان کی سابقہ سلطنت تین ممالک یعنی ایران، افغانستان اور پاکستان میں منقسم ہے۔

میری اس تحقیق کا مقصد تاریخی حقائق کی روشنی میں بلوچوں کی اصلیت اور ان کے اصل وطن کی نشاندہی اور اہمیت بیان کرنا ہے۔ میں نے اپنے اس پیش کردہ نظریے میں اپنی طرف سے حتیٰ الوسع کوشش کی ہے کہ اصل حقائق کو سامنے لاسکوں اور مبالغہ آرائی، چرب زبانی اور ادبی مرچ و مصالحہ سے کام لینے کی بجائے سادگی اختیار کروں۔ میں علم تاریخ میں اپنی کم علمی، کوتاہی، کم فہمی اور کمزوری سے آگاہ ہوں لیکن یہ ایک ایسا علم ہے جو سمندر سے بھی زیادہ گہرا ہے اگر انسان ساری زندگی تاریخ کے کسی ایک موضوع یا پہلو پر تحقیق کرے تو

شایدان تمام تر کمزوریوں کے باوجود یہ میری ایک ادنیٰ سی کوشش ہے جو نذر قارئین ہے اور میں فیصلہ بھی انہی پر چھوڑتا ہوں۔

فاروق بلوچ

بلوچستان سٹڈی سنٹر

جامعہ بلوچستان، کوئٹہ

باب اول

بلوچ

لفظ بلوچ کا اطلاق اس قوم کیلئے ہوتا ہے جو موجودہ دور میں جغرافیائی طور پر تین ممالک پاکستان، افغانستان اور ایران میں منقسم ہے جبکہ ان کی ایک بہت بڑی تعداد خلیجی عرب ممالک، افریقی ممالک، مشرق وسطیٰ اور کئی یورپی ممالک میں منتشر ہے۔

بلوچوں کی نسلی اصلیت کیا ہے اور ان کا تعلق نسلوں کے کس انسانی گروہ سے ہے، تاریخ ان کے بارے میں کیا کہتی ہے اور ان کا ماضی کیسا رہا؟؟۔ یہ وہ بنیادی سوالات ہیں جو اس تحریر کا اصل موضوع ہونگے۔

بلوچ نسلی اصلیت پر روشنی ڈالنے سے قبل انسانی نسلوں اور ان کی ذیلی شاخوں کا تذکرہ ضروری ہے تاکہ انہی کی روشنی میں بلوچوں کی نسلی اصلیت کا جائزہ لیا جا سکے۔

ماہرین بشریات اور علماء مذاہب متفقہ طور پر نسل انسانی کو تین گروہوں میں تقسیم کرتے ہیں جو درج ذیل ہیں۔

1. Semitic
    - a) Chaldean Branch
    - b) Arab Branch
2. Altics
    - a) Kargis Branch
    - b) Turkaman Branch

3. Aryans

a) Iranic Branch

b) Indian Branch. 1

بعض علماء تاریخ کے خیال میں بنی نوع انسان منگولوی، کاکیشیائی، نیگرو، آسٹریلوی اور کاپ جبکہ کچھ کا خیال ہے کہ انسان صرف پانچ نسلوں یعنی منگولوی (پیلی یعنی زرد چمڑی والے) کاکیشیائی (سفید فام لوگ گندمی رنگ والے لوگ) اور نیگرو (افریقی یعنی سیاہ فام لوگ) اور سرخ فام سے تعلق رکھتے ہیں۔2 اکثر مورخین توریت کے حوالے سے انسانوں کو نوح کے تین بیٹوں سام، حام اور یافث کی اولاد بتاتے ہیں جو طوفان عظیم کے بعد نسل انسانی کو پھیلانے کا موجب بنے۔3 مگر دوسری طرف وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اسی کشتی میں کئی دیگر افراد بھی سوار تھے ان کی آل اولاد کا کیا ہوا، علماء یہ بتانے سے قاصر ہیں۔ علاوہ ازیں یہ ابھی تک طے نہیں ہوا ہے کہ اس طوفان کا دائرہ کتنا تھا اور یہ کب آیا تھا؟ کیا اس نے پوری روئے زمین کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا یا زمین کا کچھ حصہ اس کی تباہ کاریوں کی زد میں آیا تھا؟ اگر علماء کی یہ بات مصدقہ تسلیم کی جائے تو پھر اس طوفان کا دائرہ مشرق وسطیٰ تک محدود ہوگا کیونکہ زمین کے اکثر دیگر خطوں میں طوفان نوح سے قبل کی تہذیبوں کے آثار ملتے ہیں جو اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ دنیا کے بیشتر خطوں میں سام، حام اور یافث کی اولاد کے علاوہ بھی انسان بستے تھے جو مذکورہ بالا افراد کی نسلوں سے نہیں تھے۔ قرآن پاک انسانی تخلیق کا سائنسی نقطہ نظر پیش کرتا ہے اور انسان کو ایک ہی نطفے اور ایک ہی ذی روح سے تخلیق شدہ بتاتا ہے۔4 سائنسدان بھی کسی ایک اور مخصوص نسل انسانی کے قائل ہیں۔ ان کے خیال میں ارتقائی مدارج کے دوران اکثر حیوانی نسلیں معدوم ہوتی گئیں مگر بعض ایسے جاندار بھی تھے کہ جو بدترین حالات میں بھی ارتقائی سفر کامیابی کے ساتھ طے کرتے رہے۔ ان ہی جانداروں میں سے ایک انسانوں کا جد اعلیٰ بنا۔ اس طرح لاکھوں سال قبل کے تاریخ کے آئینے میں دیکھا جائے تو انسان ایک مخصوص نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو جوں جوں شعور حاصل کرتا گیا، اپنے آپ کو مختلف نسلوں میں تقسیم کرتا گیا وگرنہ وہ جتنا ماضی میں جھانکے گا، اپنے جیسے سب انسانوں کو ایک ہی جد اعلیٰ سے پائیگا۔ بعض اہل علم انسانی اجداد کے ارتقائی سفر کو چھ سے سات کروڑ سال بتاتے ہیں۔ لہٰذا جب بھی کسی قوم کی تاریخ رقم کی جائے تو ضروری ہے کہ اس کا جائزہ سائنسی

حقائق کی روشنی میں لیا جائے کیونکہ یہ بات تو طے ہے کہ قوم کسی مخصوص نسل یا گروہ انسانی سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ یہ تاریخی عمل کے نتیجے میں وجود میں آتا ہے۔

یوں تو بلوچوں کی نسلی اصلیت کے بارے میں مختلف مؤرخین نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے ان میں سے ہر ایک نے اپنی بساط بھر کوشش کی ہے کہ بلوچوں کے اصل نسلی ماخذ کو اجاگر کیا جا سکے اس مقصد کیلئے ان مؤرخین نے دلائل کے ساتھ اپنی رائے دی ہے مگر یہ تمام مؤرخین کسی ایک نقطے پر متفق نہیں ہیں بلکہ اولاً یہ کسی ایک مخصوص نسلی گروہ سے بلوچوں کا نسلی تعلق بیان کرتے ہیں دوئم یہ تمام آراء غیر سائنسی اور غیر تحقیقی طریقہ کار کے مطابق ہیں جو صرف بلوچوں کا ایک سرسری جائزہ لیکر بیان کیا گیا ہے۔ کبھی تاریخ کے نہ تو قدیم اوراق پلٹ کر دیکھنے کی زحمت کی گئی اور نہ ہی ان کا تاریخ سے قبل کی تہذیب کے ساتھ تعلق کے امکانات دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے اگر ان کا ماضی بیان کیا گیا تو صرف چند لوکل اشعار یا زبانی روایات کو مدنظر رکھ کر ان کا جائزہ لیا گیا اور کہیں اگر ماضی کے الفاظ کی روشنی میں ان کی تاریخ پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی تو ماضی میں ادا کئے گئے الفاظ کا مفہوم غلط سمجھا گیا اس طرح ہر مورخ نے انھیں مختلف نسلی گروہوں سے منسلک کیا۔

ان اختلافات کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ بلوچوں کے اپنے مؤرخین سے قبل ان کے نسلی ماخذ پر غیر ملکیوں اور غیر بلوچوں نے رائے زنی کی ہے جسے کسی بھی طرح سے معتبر اور درست قرار نہیں دیا جا سکتا اور جب بلوچ مؤرخین نے اپنی تحقیق شروع کی تو انھوں نے سند کے طور پر غیر ملکی اور خاص کر برطانوی مواد کو سامنے رکھ کر اپنی تاریخ رقم کی ہے۔ اب یہ تو ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ برطانیہ نے کبھی بھی ایشیائی اقوام کے ساتھ نیک سلوک نہیں کیا۔ اس نے اپنے مفتوحین کی ایک ایسی تاریخ رقم کی جس نے ان کو مستقبل میں ایک لاحاصل بحث میں مبتلا کر کے اختلافات کا شکار بنا دیا۔

بلوچوں کی تاریخ کو صرف برطانیہ نے ہی نہیں بگاڑا بلکہ یہ تو ہر فاتح کا وطیرہ رہا ہے اس نے جب بھی کسی مفتوح قوم کی تاریخ لکھی ہے تو اس میں مفتوح کا خون بطور روشنائی اور اپنی تلوار کی نوک بطور قلم استعمال کرتے ہوئے رقم کی ہے ایسی تواریخ میں مفتوح کے خیالات کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی اور وہ جس طرح چاہے مفتوح کی تاریخ کو مسخ کر سکتا ہے اس پر کوئی روک ٹوک لاگو نہیں ہوتا۔ عرب، ایرانی اور برطانوی وغیرہ چونکہ فاتحین تھے اور انھوں نے بلوچوں کی سرزمین کو بزور شمشیر فتح کر لیا تھا چونکہ بلوچوں نے ان فاتحین کے خلاف لمبی اور زبردست مزاحمت بھی کی تھی اس

سے فاتحین نے ان پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد انھیں ڈاکو، جنگلی، لٹیرا، غیر مہذب، وحشی اور نجانے کتنے القاب وخطابات دے ڈالے یہ فاتح اقوام کی خاصیت رہی ہے کہ وہ اپنے مفتوح کو کبھی بھی قابل رحم نہیں سمجھتا اور اسطرح مفتوح کی جو بھی تاریخ رقم ہوتی ہے اس میں مفتوح کی رائے کا فقدان ہوتا ہے اور فاتح کی رائے ہمیشہ مقدم رکھی جاتی ہے۔

بلوچوں کی نسلی اور سیاسی تاریخ پر جتنی بھی کتابیں لکھی جا چکی ہیں ان میں بلوچوں کی نسلی اصلیت کو ملیامیٹ کر کے رکھ دیا گیا ہے اور ان کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ نہ صرف مضحکہ خیز اور حقائق سے ہٹ کر ہے بلکہ ان میں بلوچوں کی اصل تاریخ کو مزید الجھا دیا گیا۔

زیرِ نظر سطور میں بلوچوں کے حسب نسب اور تاریخی کردار وعمل کا جائزہ لیکر کسی صحیح نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے بلوچ ارتقاء کی تمام تر داستان کا احاطہ کرنے سے قبل فاضل مؤرخین کی آراء کو دیکھتے ہیں کہ وہ بلوچوں کے بارے میں کیا لکھتے ہیں اور انھیں انسانی گروہوں کے کن شاخوں سے منسلک کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے ٹی ڈبلیو وال بینک (T, W WALL BANK) اور اس کے معاون ایم ٹیلر M.Taylor کی اس بارے میں رائے کا جائزہ لیتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ۔

بلوچوں کا تعلق اقوام کے اس عظیم خاندان سے ہے جو تاریخ میں عام طور پر سامی کہلاتا ہے جس طرح کہ نام سے ظاہر ہے کہ یہ حضرت نوحؑ کے صاحبزادے حضرت سام کی نسل ہے اس اصطلاح کے مطابق مندرجہ ذیل اقوام اس زمرے میں آتے ہیں۔5

1	بابلی	Babylonians	2	آشوری	Assyrians
3	کالدین	chaldeans	4	حمورابی	Ammorites
5	کنعانی	Canaanites	6	فنیقی	Phonicians
7	عبرانی	Hebrews	8	سبائی	Sabeans
9	قبطی یا حبشی	Abysianians	10	عرب	Arabs

جبکہ بعض مؤرخین زبان کی تبدیلی کی وجہ سے یہ نظریہ تسلیم نہیں کرتے۔ ان مؤرخین کا خیال ہے کہ بلوچی زبان کے مصادر اور بنیاد آرین زبانوں کی انڈو یوروپین شاخ سے ہے۔6 جو کہ سامی النسل زبانوں سے بالکل مختلف ہے۔ پروفیسر راولنسن (Prof. Rawlinson) سب سے پہلا

مصنف ہے جنھوں نے بلوچوں کو نمرود کی اولاد لکھا اور انھیں کالدین اقوام سے منسوب کیا۔7 محمد سردار خان بلوچ بھی اسی مصنف کی تقلید میں بلوچوں کو سامی نسل لکھتے ہیں اور انھیں کلدانیوں کے کوش (Kosite) شاخ کی باقیات قرار دیتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ

"بلوچ عظیم کلدانی کوش حکمرانوں کی نسل سے ہیں اور نمرود بیلوس کی اولاد ہیں جو بابل کا حکمران تھا کلدانیوں کی حکومت کے خاتمے پر یہ یہاں سے ہجرت کر کے عرب، ایران، سیستان اور پھر مکران میں آکر آباد ہوئے"۔8

سرٹی ہولڈچ (Sir , T. Holdich) بھی اس نظریے کا حامی ہے البتہ وہ بلوچوں میں دراوڑی خون کی آمیزش کا بھی تذکرہ کرتا ہے اور بلوچوں کو کلدانیوں سے منسوب کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ لفظ بعل جو کہ کلدانی دیوتا تھا بگڑ کر بعل سے بعلوث اور بعد ازاں بلوچ بنا۔9

قرآن پاک میں لفظ نمرود کا تذکرہ کسی بھی آیت یا سورۃ میں نہیں آتا۔ ہو سکتا ہے مفسرین نے عراق کے کسی ظالم حکمران کو نمرود کہہ دیا ہو یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ عراق کے حکمرانوں کا لقب قیصر وکسریٰ کی طرح نمرود ہو۔ تاریخ میں ایک نمرود کا تذکرہ ملتا ہے لیکن وہ نوحؑ کے دوسرے بیٹے حام کی نسل سے ہے یعنی نمرود بن کوش بن کنعان بن حام بن نوحؑ۔10

توریت کی کتاب پیدائش باب دہم میں بھی ایک نمرود کا تذکرہ ملتا ہے۔11 عرب مفسرین اور مؤرخین نے غالباً اس بادشاہ کو جسے کتاب پیدائش میں نمرود کہا گیا ہے قرآن مجید کا نمرود بنادیا۔ قرآن پاک میں حضرت ابراہیمؑ اور نمرود کے واقعے کی تفصیلات تو موجود ہیں مگر نمرود کا نام کسی بھی جگہ یا آیت میں نہیں آتا علاوہ ازیں عظیم آشوری بادشاہ آشور بنی پال نے عراق میں ایک شہر بسایا تھا جسکا نام نمرود بتایا جاتا ہے۔12 لیکن یقیناً یہ نام بعد کے زمانے میں اسے ملا ہوگا۔ پہلی ہزارویں قبل مسیح میں آشور کے شہر سے بالائی جانب ایک شہر موجود تھا جسے کلاہ (Calah) کہا جاتا تھا یہی شہر بعد میں نمرود مشہور ہوا۔13 یہ نمرود کیوں کہلایا جانے لگا اسکی کوئی وجہ معلوم نہیں اور نہ اب تک ایسا کوئی سراغ ملا ہے کہ جس سے کچھ ثابت ہو سکے۔ درج بالا تمام دلائل کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ماسوائے قرآن پاک کے اور ایسی کوئی آسمانی کتاب یا صحیفہ نہیں ہے کہ جس میں اسی مذہب کے ماننے والوں نے ترامیم وتحریف نہ کی ہو ایسا انھوں نے اپنے آپ کو مذاہب کی کچھ سخت پابندیوں اور قوانین واحکامات سے آزاد ہونے یا ان میں نرمی کرنے یا پھر مذہب کو ایک

دیومالائی داستان بنانے کیلئے کیا۔ یہود (بنی اسرائیل) کے بارے میں کہا جاتا ہے بلکہ ورطہ تحریر میں ہیں کہ اللہ تعالی نے سب سے زیادہ پیغمبر اسی قوم میں بھیجے مگر ان کی نافرمانی، شرک اور مذہب سے بیزاری کی عادت نہیں گئی۔ تب اللہ تعالی نے ان سے پیغمبری چھین کر عربوں کو تھمادی۔ حتیٰ کہ یہود اپنے مفادات کی خاطر پیغمبروں کے قتل سے بھی اجتناب نہیں کرتے تھے پھر ایک ایسی قوم سے جو اپنے پیغمبروں تک کو قتل کر سکتی ہے اور ہمیشہ مذہبی سختیوں سے دور بھاگتے تھے جوں ہی کوئی سخت گیر حاکم یا پیغمبران پر مقرر ہوتا تو وہ تائب ہو جاتے مگر پھر بھی اپنی شرارتوں سے باز نہ آتے اور جوں ہی موقع ملتا وہ دوبارہ دنیاوی راحتوں اور آلائشوں کی طرف لوٹ جاتے اور اپنی الہامی کتابوں میں ترمیم اور تحریف صرف اپنی خواہش ذات کیلئے کرتے تھے۔ ان سے اس بات کی امید کیسے رکھی جائے کہ انھوں نے کسی ظالم بادشاہ کو جس نے ان پر مظالم ڈھائے ہوں نمرود کہہ دیا ہو قران پاک سے بڑھ کر کوئی علمی نسخہ اتنا مستند نہیں ہے مگر اس اللہ کے کلام میں نمرود کا نام کہیں نہیں آتا۔ ہوسکتا ہے کہ عرب مفسرین قران و مؤرخین نے یہودیوں کی کتابوں سے استفادہ کیا ہو۔ بہر حال جو قران میں موجود نہیں ہے ایسے فرضی شخصیت کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت ابراہیم کا مقابلہ عراق کے یقیناً کسی عکادی بادشاہ سے ہوا تھا کیونکہ معلوم تاریخ میں عراق کی بادشاہتیں کچھ اس طرح سے تھیں۔

1۔ **سمیری یا سومیری Sumer**۔ ان کا زمانہ حکومت 3200 قبل مسیح سے لیکر 2800 قبل مسیح تک ہے یہ جنوبی عراق میں آباد تھے ان کی نسلی اصلیت کے بارے میں کچھ معلوم نہیں بعض ان کو سندھ کی قدیم تہذیب کے باشندوں کی نسلوں سے تعبیر کرتے ہیں 14 یہ ان لیل، اُنو، انکی، شمس، انانا دیوی (چاند دیوی) عشتار دیوی (محبت کی دیوی) کی عبادت کرتے تھے۔ 14 انھوں نے سب سے پہلے دن اور رات میں وقت کو تقسیم کیا یعنی 24 گھنٹوں میں۔ انھیں 24 گھنٹے کے 60 منٹ اور ایک منٹ کے 60 سیکنڈ کا حساب معلوم تھا انھوں نے سال کو 12 مہینوں میں تقسیم کیا اور ہر مہینے کے 30 دن مقرر کئے بقایا 5 دن نوروز کے مذہبی اور معاشرتی تہوار کیلئے مخصوص کئے۔ 15

2۔ **سامی الاصل Semities.**۔ سامی اقوام میں بھی بڑے بڑے حکمران گذرے ہیں انھوں نے عراق پر 2800 قبل مسیح سے 2350 قبل مسیح تک حکومت کی لیکن ان

کے دور میں عراق طوائف الملوکی کا شکار ہوا۔ ان میں ایک مضبوط حکمران گل گامیش بھی گذرا ہے۔ بعض ذرائع سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا اور ابدی زندگی کی خاطر بڑا لمبا سفر طے کیا تھا لیکن وہ اپنے مقصد میں ناکام ہوا۔ 16 اس دور میں عراق کے بہت سارے شہروں نے خوب ترقی کی اور اپنی انفرادی خودمختار حیثیت میں بھی ان کی تجارت، علم وفن اور ترقی نقطۂ عروج پر تھی اس دوران اُر، کیش، نیفر، لاگاش، اوبک، اریدو اور لارسا وغیرہ نے کافی شہرت حاصل کی اور معاشی طور پر عراق خودکفیل اور مالا مال ہوا۔ سامی الاصل اقوام کی بادشاہت پہلی عکادی حکمرانوں نے ختم کردی اور عراق میں عکادیوں کی پہلی بادشاہت قائم ہوئی۔ 17

3۔ **عکادی۔ AKKADS**۔ عکادیوں نے نہ صرف عراق میں ایک نئی تہذیب کی بنیاد رکھی بلکہ دنیا کو جدید تہذیب سے روشناس کرایا۔ عکادیوں کا عظیم حکمران شروقین اول (SARGON-1st) نے پچاس سال حکومت کی یعنی 2350 ق م سے 2300 ق م تک اور بعض ذرائع سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے اس وقت کے دریافت شدہ دنیا کے تین چوتھائی پر قبضہ کر لیا تھا۔ 18 شروقین اول کے بعد اس کا پوتا نرماسین Narmasin حکمران بنا جس نے خداوند عکاد God of Akkad کا لقب اختیار کیا اور اپنی سلطنت کو مزید وسعت دی اسکی وفات کے بعد عکادیوں کی پہلی بادشاہت اختتام پذیر ہوا اور 2150 ق م میں عراق پر ایران کے گوتھ (Gutians) خاندان نے قبضہ کرلیا۔

4۔ **گوتھ یا پیشدادی Gutians**۔ یہ ایران کا اول حکمران خاندان تھا ان کے دور میں عراق میں مکمل افراتفری رہی اور عکادی تہذیب کو شدید نقصان پہنچا اس خاندان کو عراق سے آخرکار اریک کے خودمختار حکمران اروکیگل (Arokigal) نے نکال دیا۔

5۔ **عکادیوں کی دوسری بادشاہت (Akkads 2nd)**۔ ان کی دوسری بادشاہت کا آغاز 2050 ق م میں ہوا جو انتہائی کامیاب ثابت ہوا اور عراق کو کامیاب حکمران نصیب ہوئے ان میں اُرنامو (Ornamu) شلگی (Shulgi)، برشین (Bursin)، شوشین (Shusin)، ابویا ابی شین (Ibbisin)، وغیرہ انھوں نے سومیریوں اور پہلی عکادی حکمرانوں کی قائم کردہ شہری ریاستوں کو جدت اور ترقی دی اور بام عروج تک پہنچایا۔

ان میں ایک مشہور بادشاہ گذرا ہے جسکا نام شلگی تھا۔ اس نے بانگ دہل خدائی کا دعویٰ کیا

تھاعکادیوں کی دوسری بادشاہت 1800 ق م تک قائم رہی اس کے بعد آشوریوں نے عراق پر اپنا تسلط جما لیا۔ 19 اس سے آگے کی بادشاہوں کے تذکرے کی یہاں پر ضرورت نہیں ہے کیونکہ ماہرین تاریخ اور علما مذاہب حضرات ابراہیمؑ کا دور 2150 ق م سے 1800 ق م بتلاتے ہیں اس دوران عراقی بادشاہت میں نرماشین اور شلگی کی حکومت رہی تھی دونوں نے خدائی کے دعوے کیے تھے الگ الگ عبادت گاہوں میں لوگوں سے اپنی پوجا کرواتے تھے ایک کا دارالخلافہ اریک اور دوسرے کا ارنامی شہر تھا اگر شلگی کے حالات زندگی پر غور کیا جائے تو ہر پہلو سے یہی وہ شخصیت نظر آتی ہے جسکا مقابلہ حضرت ابراہیمؑ سے ہوا تھا اور بعد کے مفسرین نے شلگی (Shulgi) کو کتاب پیدائش کا نمرود بنا دیا۔ شلگی نے رازق ہونے کا دعویٰ کیا تھا اور لوگوں کو اپنی عبادت کے بدلے کھانا کھلاتا تھا اور جو اسکی عبادت کرنے سے انکار کرتا تو اسے سخت اور اذیت ناک سزائیں دیتا تھا۔

لہٰذا وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ محمد سردار خان بلوچ کی یہ رائے کہ بلوچ نمرود کی اولاد ہیں، یقیناً حقائق سے ہٹ کر ہے کیونکہ نمرود نامی شخص کا تذکرہ اور مفصل حالات کہیں پر بھی نہیں ملتے یقیناً یہودی ذرائع نے عراق کے عکادی بادشاہوں میں سے کسی کو نمرود لکھ دیا ہو۔ بہر حال یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ نمرود نامی یہ بادشاہ حقیقت تھا کہ صرف ایک افسانوی کردار البتہ بلوچوں کا ان عکادی سامیوں کے ساتھ کوئی نسلی رشتہ نہیں بنتا۔

سر، ٹی ہولڈچ (Sir T Holdich) کے کلدانی نسل نظریے سے بھی اتفاق نہیں کیا جا سکتا جس میں وہ لفظ بعل کو بعلوث اور بعد ازاں بلوچ کا نعم البدل قرار دیتا ہے ہولڈچ کے نظریے کو پرکھنے اور جانچنے کیلئے ایک بار پھر عراقی تہذیب کا جائزہ لینا ہوگا اور کنعان کی تاریخ پر نظر دوڑانی ہوگی۔

6۔ **آشوری Assyrians**:۔ عراق میں عکادیوں کی دوسری بادشاہت کا خاتمہ 1800 ق م میں ہوا اس کے بعد قدیم آشوریوں نے بالائی دجلہ اور دریائے اب پر قبضہ کر لیا آشوری سامی نسل کہلاتے ہیں مگر ان میں دیگر نسلوں کی آمیزش بھی پائی جاتی تھی۔ ان کی پہلی دور حکومت کامیاب نہ رہی کیونکہ شمالی حتیوں نے ان پر حملہ کر کے ان کے بیشتر علاقے ہتھیا لیئے اور ان کی معیشت پر زبردست چوٹ لگائی آخرکار آشوری حکمران شمشی اداد (Shimshi Idad)

نے آشوریوں کو مکمل تباہی سے بچانے کی خاطر عراق کو تقسیم کر دیا عراق میں چھوٹی چھوٹی شہری ریاستیں قائم ہو گئیں اور مکمل طوائف الملوکی شروع ہو گئی اگرچہ آشوری 1717 ق،م تک عراق کے بیشتر علاقوں پر قابض رہے لیکن 1728 ق م ہی میں ان کی بابل کی نئی ابھرتی ہوئی قوت حمورابی (Ammorites) سے زبردست جنگیں شروع ہو چکی تھیں اور آخرکار 1717 ق م میں انھیں مکمل شکست ہوئی اور بابل کے حمورابی عراقی تہذیب کے وارث بنے۔ آشوریوں کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے عظیم دیوتا آشور کی وجہ سے آشوری کہلائے۔

7۔ **حمورابی Ammorites**: 1728 ق م حمورابی بابل کا پہلا حکمران بنا اس نے عراق کی مختلف ریاستوں کو ایک کنفیڈریشن میں شامل کیا۔ اس کنفیڈریشن میں بابل Babylon، قطنہ Qatna، لارسا Larsa، اشونا Eshnunna، حلب Allepo شامل تھے۔ اس نے ایک الگ معاہدے کے ذریعے بابل، لارسا اور ماری Maari کی ریاستوں کی ایک سہ گانہ لیگ بھی بنائی۔ حمورابی ایک کامیاب حکمران گذرا ہے اس نے پتھر کی ایک لاٹ پر دنیا کا پہلا تحریری آئین مرتب کیا وہ لاٹ اب بھی پیرس کے شہرہ آفاق عجائب گھر لوور (Louver) میں محفوظ ہے۔ 20 حمورابی کا تعلق چونکہ بابل سے تھا لہٰذا وہ مردوک یا مردوخ (Mardookh) دیوتا کی پوجا کرتے تھے۔ 21 بابل کی پہلی بادشاہت اس وقت ختم ہوئی جب 1531 ق م میں حتی (Hitti) بادشاہ مار شلیس (Marshalis) نے بابل کو نذر آتش کر دیا۔

8۔ **ایرانی کسدی یا ایلمی (Elum)**۔ حمورابیوں کے خاتمے کے بعد ایران کے کسدیوں کو عروج حاصل ہوا یہ عیلامی یا ایلمی تھے، ان کی حکمرانی سرزمین دجلہ و فرات پر تقریباً 1160 ق م تک رہی۔

9۔ **نبوکدنضر اول (Nebu Shadnezzar 1st)**۔ کسدیوں کے بعد نبوکدنضر اول نے عارضی طور پر بابل میں اپنی حکومت ترتیب دی یہ 1137 ق م کا زمانہ تھا اس دوران دنیا میں ہر سمت موسموں نے افراتفری مچا دی اور شمالی خطوں سے برفانی طوفانوں نے ایک وحشی اور غیر مہذب قوم کو آباد، زرخیز اور مہذب دنیا کی طرف دھکیل دیا۔ یہ آرین تھے جنہوں نے 1500 ق م کے لگ بھگ شمالی خطوں سے بیک وقت ایران، یورپ، اور ہندوستان پر یلغار کر دی۔ وہ بڑی تعداد میں دنیا بھر میں پھیل گئے عراق پر نبوکدنضر اول کے دور میں ہوری یا آوار

(Hurrians) قبائل نے حملہ کر دیا آوار قبائل کا حملہ شمالی عراق میں جھیل وان (Lake Van) کیجانب سے ہوئی یہ قبائل کمار بی (Kumarbi)، چیپت (Chepatt) دیوی (سورج دیوی) تیز ود (Tesud) دیوتا وغیرہ کی پوجا کرتے تھے۔

10۔ آشوریوں کی دوسری حکومت ۔ 1164 ق م میں آشوریوں نے ایک بار پھر اقتدار پر قبضہ کرلیا یہ وسطی آشوری دور کہلاتا ہے ان کا پہلا حکمران اریب اداد (Eriba Idad) تھا 1105 ق ،م میں اسکی وفات کے بعد اسکا بیٹا آشور پال اول (Assuruballit 1st) حکمران بنا حتیٰ کہ انکی حکمرانی 1074 ق م میں آرامیوں نے ختم کردی۔ آشوری آشور دیوتا کی پوجا کرتے تھے اور یہ درجہ بادشاہ کی ذات کو حاصل تھا وہ (Son of God) خدا کا بیٹا کہلاتا تھا۔ آشوریوں کا دور 1075 قبل مسیح کے بعد جاری نہ رہ سکا۔

11۔ آرامی (Aramanaeans) ۔ 1074 ق م سے 909 ق م تک آرامیوں کے زیر تسلط عراق میں مکمل انتشار اور بدامنی رہی آخر کار ایک بار پھر آشوریوں نے عراق پر اپنا تسلط قائم کرلیا 909 ق م میں انھوں نے آرامیوں کو شکست دیکر عراق میں اپنی تیسری بادشاہت قائم کی۔

12۔ آشوریوں کی تیسری بادشاہت ۔ آشوریوں کی تیسری بادشاہت میں عظیم حکمران گذرے ہیں جنہوں نے عراقی تہذیب کو بام عروج تک پہنچا دیا اور بابل دنیا کا عظیم ترین شہر بن گیا۔ ان بادشاہوں میں ادادنراری دوئم Idad Nirari، آشور نصیر بنی پال دوئم Assur Nasira Pali 2nd، شلمانیز رسوئم Shalmaneser 3rd سمورات یا سمی رامس (806 ق م تا 810 ق م) Semiramis or Sammuramat، ادادنراری سوئم Idad Nirari 3rd، تگلا د پلاذرسوئم Tiglath Pileser 3rd، سارگون دوئم Sargon 2nd، اور سینا چیرب، Sena Cherib وغیرہ شامل تھے۔ آشوریوں کی تیسری بادشاہت 625 ق م تک قائم رہی۔ جسطرح پہلے ذکر ہوا کہ آشوری آشور دیوتا کی پوجا کرتے تھے یہ درجہ بادشاہ کا تھا اور وہ ان کا قومی دیوتا تھا۔

13۔ کلدانی Kaldeans or Chaldeans:- 625 ق م میں بابل پر نئی بابلیوں یعنی کلدانی قوم نے قبضہ کرلیا۔ ان کی حکومت 539 ق م میں ایران کے عظیم ہخامنشی

Aschamanid حکمران سائرس اعظم نے ختم کردی۔22 کلدانیوں میں عظیم بخت نصر دوئم Nebu Chadnezzar IInd نے کلدانی سلطنت کو بام عروج تک پہنچایا۔ اہل کلدان کا قومی اور مذہبی دیوتا مردوک یا مردوخ Mardookh تھا جسے انھوں نے خدا کا درجہ دیا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے دیگر دیوی دیوتاوں میں عشتار دیوی، سورج دیوتا (سین دیوتا) اور چاند دیوتا شامل تھے۔23

مندرجہ بالا سطور میں سرٹی ہولڈیچ کے نظریے کی جانچ کی خاطر پورے دجلہ وفرات کے سرزمین کی قدیم تہذیب کا سرسری جائزہ لیا گیا مگر اس پورے خطے کے ماضی میں بعل دیوتا کے پجاری کہیں پر بھی نظر نہیں آئے۔ البتہ بعل دیوتا کی پوجا کنعان کی سرزمین کے فینقی باشندے کرتے تھے جو 1000 ق م میں ہی آہستہ آہستہ کنعانی سرزمین یعنی شام، لبنان، فلسطین، سیدون، ٹائر اور بیروت وغیرہ میں پھیلنا شروع ہو گئے تھے اور انھوں نے تمام سمندری تجارت پر غلبہ حاصل کرلیا تھا۔

یہ ایک تجارت پیشہ قوم تھی اور معاشی لحاظ سے انتہائی مستحکم اور مضبوط تھی ان کے مندرجہ ذیل دیوتا تھے بعل Baal، ہامون Hammun، استریات Astrate وغیرہ۔ 24 یہ واضح ہے کہ بلوچ فنیقیوں کی باقیات نہیں ہیں فنیقی تاجر پیشہ تھے اور ہمیشہ نئی منڈیوں کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے جبکہ بلوچوں کی خصلت اس کے بالکل برعکس ہے یہ کبھی تاجر پیشہ نہیں رہے اور نہ ہی کبھی فینقیوں نے ایرانی یا وسط ایشیائی پلیٹو کے رہنے والوں میں اپنے دیوتا بعل کو متعارف کروایا اور نہ ہی بعل کسی اور زبان میں بگڑ کر یا تبدیل ہوکر بعلوث بنا ہے اور نہ ہی اسکی کوئی مستند سند دستیاب ہے۔ لہٰذا مصنف موصوف کے نظریے سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ جہاں تک اس نظریے کا تعلق ہے کہ بلوچوں میں دراوڑی خون کی آمیزش پائی جاتی ہے تو اس سے بھی اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک الگ اور وسیع بحث ہے اس تہذیب کو جانچنے کی خاطر وادیءِ سندھ اور پنجاب کے ماضی میں جانا ہوگا جہاں آرین حملوں سے قبل ایک وسیع تہذیب موجود تھی اس تہذیب کے ایک اہم شہر کے کھنڈرات 1922 میں مسٹر آر، ڈی بینرجی (Mr. R.D Banergi) نے جو کہ برطانوی دور میں مغربی حلقے کے آرکیالوجی سپرنٹنڈنٹ تھے، سر جان مارشل (Sir Jan Marshall) کی قیادت میں ضلع لاڑکانہ (سندھ) میں موہن جوڑو کے مقام پر دریافت کر

لئے۔25 بعدازاں اسی تہذیب کے ایک اور بڑے شہر کے آثار ہڑپہ کے مقام پر دریافت کر لئے گئے یہ مقام ضلع ساہیوال میں ہے جہاں سرجان مارشل نے باقیاتی تفتیش کا کام کیا۔

وادیٔ سندھ کے ان دو عظیم وقدیم شہروں کے باسیوں کے بارے میں ماہرین لکھتے ہیں کہ وہ باشندے دراوڑ تھے جو ہندوستان کے قدیم کول نسل کے ساتھ اکھٹے رہتے تھے مگر کول نسل کے باشندوں کی نسبت دراوڑ زیادہ مہذب اور مدنیت کے قائل تھے برصغیر میں دراوڑوں کی آمد کے بارے میں تاریخ خاموش ہے۔البتہ بعض قیاسات سے پتہ چلتا ہے کہ دراوڑ تقریباً 7000 ق م میں شمالی ایران، جنوبی عراق اور کاکیشیا سے ہجرت کر کے یہاں آئے ہونگے۔ جبکہ بعض کا خیال ہے کہ دراوڑ شمال مغربی پاکستان کے دروں سے ہندوستان میں داخل ہوئے ہونگے کچھ ماہرین بشریات انھیں افریقی نسل خیال کرتے ہیں چند ایک انھیں کول نسل کے شاخوں بھیل اور گونڈ سے متعلق ظاہر کرتے ہیں۔26

دراوڑوں کے بارے میں مندرجہ بالا تمام نظریات فرضی اور من گھڑت ہیں۔ سر ہربرٹ رسلے بھی ان کے بارے میں ایک نظریہ رکھتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ دراوڑ ہندوستان کے اصلی باشندے تھے جن میں آریہ اور منگول خون کی آمیزش سے بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ وہ آریاؤں کی آمد سے بہت پہلے جنوبی ہند میں آباد تھے۔27

لیکن یہ تمام تر قیاسات ہیں ان کے بارے میں تاریخ اس وقت خاموش رہیگی جب تک موہن جودڑو سے برآمد ہونے والی تحریریں نہیں پڑھی جاتی ہیں۔ یہ نظریہ کہ بلوچوں میں دراوڑی خون کی آمیزش پائی جاتی ہے سب سے پہلے برطانیہ کا گرینڈ ماسٹر ڈینس برے (Denis Brey) نے پیش کیا۔ اس نے براہوئی ، بلوچوں کو دراوڑ قرار دیا اور براہوئی زبان کو دراوڑی زبانوں کی ایک شاخ سے تشبیہ دی ساتھ ہی اسے دیگر دراوڑی زبانوں تلنگی (Tlangi)، تامل (Tamil)، ملیالم (Malyalam)، اور کناری (Kanari) کی طرز کا ایک زبان قرار دیا۔ یہ زبانیں اب بھی جنوبی ہندوستان میں بولی جاتی ہیں۔

اس سوال کے جواب میں ہمیں بلوچستان کے ماضی قدیم میں جانا پڑے گا اس ماضی میں جو ابھی تک قدیم ٹیلوں کے نیچے دفن ہے اور تاریخی دور سے پہلے کی تہذیب ہے یعنی بلوچستان کی ماقبل تاریخ کے تہذیبی نقوش کا جائزہ لینا ہوگا کہ اس عظیم الشان تہذیب کے بانی کون تھے جنھوں

نے مختلف صنعتوں، ظروف سازی، بت تراشی و بت سازی، مجسمہ سازی، گلہ بانی اور زراعت کو بام عروج تک پہنچایا تھا جن کا جمالیاتی ذوق اتنا اعلیٰ تھا کہ وہ 11000 ہزار سال پہلے بھی زیورات کو ظاہری خوبصورت اور دلکشی کیلئے پہنتے تھے اور زراعت وظروف سازی کو خوب ترقی دی تھی۔ وہ نہ صرف مختلف اقسام کے برتن بنانا جانتے تھے بلکہ زراعت کے جدید اصولوں سے آگاہ تھے۔ وہ تجارتی گزرگاہ پہ رہتے تھے اس لئے ان کی اپنی تجارت بھی عروج پر تھی اور ان کے مراکز معاشی منڈی کی حیثیت رکھتے تھے جہاں وہ چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں رہ کر گلہ بانی، زراعت اور ظروف سازی کی ترقی کا موجب بن رہے تھے تو دوسری طرف شہروں میں انہوں نے تجارت کو خوب فروغ دیا تھا ان کا اہم ترین مرکز مہر گڑھ تھا، جبکہ قلات، خضدار، نال، بیلہ، پنجگور، کیچ، گوادر اور پسنی بھی مرکزی حیثیت رکھتے تھے ماضی قدیم سے ہی یہ سارے شہر آپس میں منسلک تھے اور ان کے آپس میں تجارتی اور ثقافتی تعلقات قائم تھے بلکہ یہی نہیں ان کے تعلقات ژوب سے لیکر ساحل مکران اور کرمان سے لیکر کوہ سلیمان تک یکساں تھے اور اس پورے خطے میں ایک ہی تہذیب کے آثار ملتے ہیں۔ ژوب سے لیکر ساحل مکران تک جتنے بھی برتن، مجسمے، کھلونے، مورتیاں اور دیگر اشیاء برآمد ہوئی ہیں، ان کا آپس میں نہ صرف گہرا تعلق واضح نظر آتا ہے بلکہ بالکل یکساں لگتے ہیں وہی برتن وہی مورتیاں اور وہی جانوروں کے مجسمے گو کہ وسیع پیمانے پر بلوچستان کے آثار قدیمہ پر تحقیق اور باقیاتی تفتیش کا کام نہیں کیا گیا بلکہ صرف چند ٹیلوں کا جائزہ لیکر چند من گھڑت اور فرضی نظریات قائم کئے گئے۔ ان میں بھی یکسانیت نہیں پائی جاتی صرف مہر گڑھ ایک ایسا مقام ہے جہاں وسیع پیمانے پر کھدائی کی گئی اور تحقیقات کے نتیجے میں جو حیرت انگیز انکشافات ہوئے انھوں نے ماہرین آثار قدیمہ اور ماہرین بشریات کے اس نظریے کی نفی کر دی کہ انسانی آبادی اور ارتقاء کا آغاز یا انسانی تہذیب کا آغاز دجلہ وفرات کی وادی سے ہوا ہے کیونکہ مہر گڑھ کی قدامت عراق کی جرمو تہذیب سے کہیں زیادہ قدیم ہے جسکی قدامت 10000 سے 11000 ہزار سال بتائی جاتی ہے۔28 جبکہ عراقی تہذیب کے بارے میں مورخین اور ماہرین 8000 سے 10000 سال کے اعداد پر اتفاق کرتے ہیں۔29

جبکہ دراوڑ تہذیب کی قدامت بھی 4000 سے 6000 سال بتائی جاتی ہے۔30 ماہرین کہتے ہیں کہ اس سے قبل کا انسان غاروں اور جنگلوں میں رہتا تھا اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مہر

گڑھ (بلوچستان) کی تہذیب سمیرین (Sumerians) اور دراوڑوں (Dravadians) کی تہذیب سے بہت پہلے کی تہذیب ہے کچھ بعید نہیں کہ سمیری اور دراوڑ بلوچستان سے اٹھ کر عراق اور ہندوستان کی تہذیبوں کے بانی بنے ہوں مگر ایسے کوئی شواہد نہیں ملتے کہ عراقی یا دراوڑی تہذیب قدامت کے لحاظ سے بلوچستان کی مہر گڑھ تہذیب سے زیادہ قدیم ہوں البتہ بلوچستان کی تہذیب مختلف وجوہات کی بناء پر اس عروج پر نہیں پہنچ سکی کہ کسی بڑی بادشاہت اور شہنشائیت کو جنم دیتی مگر اس کے مقابلے میں عراق اور سندھ، پنجاب (قدیم ہند) کی تہذیبیں بام عروج تک پہنچ گئیں بعد ازاں دراوڑ دی تہذیب نے سندھ و پنجاب میں بڑے بڑے شہر قائم کئے۔ دریائی اور سمندری تجارت کو فروغ دیا۔ مختلف صنعتیں قائم ہوئیں اور اس دوران زراعت نے خوب ترقی کی آہستہ آہستہ دراوڑی تہذیب پھیلتے پھیلتے بلوچستان کے حدود تک آ پہنچا مگر یہ بہت بعد کے زمانے کی بات ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر بلوچستان سے اٹھ کر مشری وسطیٰ اور ہندوستان پہنچنے والی تہذیب ترقی کرکے بام عروج تک جا پہنچتی ہے اور بڑی بڑی سیاسی سلطنتوں کے وارث بنتے ہیں مگر بلوچستان کی تہذیب ارتقاء کے عمل میں بہت پیچھے رہ جاتی ہے؟

اس کا جواب انتہائی آسان ہے کہ جہاں پانی ہوتی ہے وہاں زندگی ہوتی ہے۔ آج جو صورتحال بلوچستان میں پانی کے حوالے سے ہے ماضی قدیم میں بھی یہی صوتحال تھی جن خطوں میں پانی دستیاب تھا چھوٹے چھوٹے دیہات اور قصبے بنتے گئے اور لوگ آباد ہو کر اپنا گذر بسر کرنے لگے ورنہ باقی ماندہ علاقہ میں ہو کا عالم چھایا رہا مگر اس کے برعکس عراق اور ہندوستان میں بڑے بڑے دریا بہتے ہیں دجلہ، فرات، سندھ، چناب، راوی وغیرہ لہٰذا وہاں زندگی میں ایک انقلاب آیا لوگوں کی ایک بڑی آبادی سندھ و پنجاب منتقل ہوگئی وہاں بڑے بڑے شہر بن گئے اور علوم وفنون نے وہاں خوب ترقی کی حتیٰ کہ ہزاروں سال بعد دراوڑی تہذیب کی سرحدیں بلوچستان کی نال اور کولی تہذیب کی سرحدوں کے ساتھ منسلک ہوگئیں اس وقت تک ہندوستان بذات خود کئی اقوام اور کئی زبانوں کا مجموعہ بن چکا تھا کیونکہ ہر سمت سے لوگ بلوچستان کے راستے ہندوستان کی سرسبز و آباد زمینوں کا رخ کرنے لگے تھے۔ 3000 ق م کے بعد دراوڑ تہذیب کی سرحدیں سراوان اور جھالاوان (قلات خضدار) کے ساتھ منسلک ہوگئی تھیں حتیٰ کہ مکران بھی اس

کے زیر اثر تھا۔ 31 ممکن ہے اعلیٰ تہذیب ہونے کی وجہ سے اس نے کولی اور نال کلچر پر اپنے اثرات چھوڑے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ قلات ان کے زیر اثر رہا ہو کیونکہ وہ (دراوڑ) سیوا یا شیوا دیوتا کی پوجا کرتے تھے۔ 32 اور قلات آج بھی سیوا قلات (Seva Kalat) کے نام سے مشہور ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب تہذیب نے ہی بلوچستان میں جنم لیا اور یہاں سے ایک کہکشاں (Galaxy) کی طرح بلوچستان نے باقی تہذیبوں کو بنیاد فراہم کی تو یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے قدیم باشندے جو بذات خود بلوچستان سے یا بلوچستان کے راستے ہندوستان پہنچے ہوں، بلوچستان کے باشندوں کے جد اعلیٰ ہو سکتے ہیں لہٰذا دراوڑی نظریہ سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا ویسے بھی براہوئی زبان میں دراوڑی کے شاید چند الفاظ ہوں ورنہ براہوئی میں فارسی، بلوچی اور عربی زبان کے الفاظ دراوڑی زبان کی نسبت کئی زیادہ ملتے ہیں لہٰذا براہوئی زبان کو دراوڑ قوم کی باقیات کہنا مضحکہ خیز خیال ہے علاوہ ازیں دراوڑوں کے عروج اور ترقی کی بنا پر انھیں بلوچستان کی قدیم تہذیب کا جد اعلیٰ کہا گیا ہے حالانکہ تاریخی اور تہذیبی نقوش اس رائے کی نفی کرتے ہیں اور یہ ثابت کرتے ہیں کہ عراق اور سندھ و پنجاب کی قدیم تہذیبوں سے قبل یہاں مہر گڑھ کی تہذیب موجود تھی جو عالمی تجارت کیلئے ایک سنگم کی حیثیت رکھتا تھا ان تہذیبوں کا تجارتی تعلق ہو سکتا ہے اور ثقافتی روابط بھی ہو سکتے ہیں مگر نسلی اور قومی بنیادوں پر دراوڑوں کی مخلوط نسل کا بلوچوں سے کوئی رشتہ نہیں بنتا البتہ یہ درست ہے کہ ان کی سرحدیں آپس میں منسلک تھیں۔ اشیاء تجارت کا تبادلہ ہوتا تھا تہذیبوں کے اس قدر قربت سے زبان کا متاثر ہونا فطری سی بات ہے مختلف مؤرخین اور ماہرین بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ سندھ و ہند کی قدیم تہذیب در اصل بلوچستان کی تہذیب کا تسلسل ہے۔ 33

کوبمی براہوئی قبائل کو دراوڑ تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ 34

ماضی قدیم سے چونکہ بلوچستان ایک اہم ترین گذرگاہ رہی ہے اور قلات و جھالاوان کا راستہ ہمیشہ فاتحین اور تاجروں کیلئے بحیرہ عرب کے بلوچ ساحلوں تک پہنچنے کا ایک آسان اور سہل راستہ رہا ہے شہر قلات اور خضدار ان زمانوں میں جبکہ آس پاس نئی نئی تہذیبیں جنم لے رہی تھیں آباد تھے اور ان نئی جنم لینے والی تہذیبوں سے منسلک ہو کر مزید اہمیت اختیار کرتے جا رہے تھے جو فاتحین اور تاجران راستوں سے گذرتے تو وہ بغرض تجارت ان علاقوں میں اپنی کوٹھیاں قائم کرتے

جن میں ان کے نمائندے اقامت پذیر ہوتے اور فاتحین ان علاقوں میں اپنی فوجی چوکیاں قائم
کرتے جہاں ان کی رہائش ہوتی۔ اس طرح آہستہ آہستہ ان خطوں میں کئی نئی زبانیں مقامی زبان
کے ساتھ ملکر ایک اور نئی زبان کا موجب بنے۔ بلوچستان کو آریا، ساکا، کشان، ہن، سفید ہن،
یونانی، عرب، منگول حتیٰ کہ ہر زور آور نے جولان گاہ بنائے رکھا بعد کے زمانوں میں بننے اور
بلوچستان میں متعارف ہونے والی کسی بھی تہذیب یا حکومت نے بلوچستان کی اپنی تہذیب وتمدن
کو کبھی ترقی نہیں دی اور نہ ہی اسکی اپنی تہذیب کو پنپنے دیا گیا۔ لہٰذا آئے روز کے حملوں اور
ہنگاموں نے یہاں کے مکینوں کو کبھی پہاڑوں کا راستہ دکھایا تو کبھی میدانوں کو لالہ زار بنا دیا گیا
لہٰذا یہاں کی اپنی تہذیب آس پاس کی تہذیبوں سے کسی حد تک محفوظ رہ کر اپنے ماضی کے اندر ہی
رہا۔ اس نے کبھی اعلیٰ تہذیب کی شکلِ اختیار نہیں کی مگر اعلیٰ ترین تہذیبیں بھی چند صدیوں سے زیادہ
عمر نہ پا سکے مگر محدود اور سادہ بلوچ تہذیب ابھی تک ماضی کے قدیم نقوش لئے زندہ و پائندہ ہے۔
ماضی کے دراوڑ آج جنوبی ہند کے کونوں کھدروں میں دبے ہوئے ہیں جبکہ غیر سامی سمیری اقوام
ماضی کی تاریکیوں میں معدوم ہو چکے ہیں مگر پسماندگی اور محدود وسائل کے اندر رہتے ہوئے
بلوچستان کی قدیم تہذیب آج بھی بلوچ معاشرے کی شکل میں زندہ ہے۔

اسی طرح ہر آنے والا طاقتور ان فوجی اور تجارتی راستوں پر قابض ہو جاتا جو درہ مولہ اور درہ
بولان کے راستے سندھ اور ہند کی طرف جاتے تھے اور ساحل کے راستوں پر۔ جس طرح ڈینس
برے نے بلوچ قومیت کی تقسیم کی خاطر بلوچ دراوڑ امتزاج اور آمیزش کی بات کی اسی طرح جب
عرب حملہ آور اس خطے میں آئے تو انہوں نے مقامی باشندوں کو کردوں سے تشبیہ دی۔ شاید ان
کے حلیے، سپاہیانہ لباس اور لڑنے کے وحشی انداز سے انھوں نے انھیں ترکوں سے تشبیہ دی۔
ایرانی بھی انھیں اپنے سیاسی اور فوجی مفادات کے حصول کی خاطر کوچ و بلوچ میں تقسیم کرتے تھے۔

1810ء سے قبل تاریخ میں لفظ براہوئی کہیں پر استعمال نہیں ہوا۔ دراصل یہ برطانوی
قابضین اور حملہ آوروں کی توسیع پسندانہ پالیسی کا ایک حصہ تھا کہ تقسیم کرو اور حکومت کرو یعنی
(Divide and Rule) لہٰذا جب 1810ء میں میر محمود خان اول کے دور حکومت کے دوران
پہلا یورپی یعنی برطانوی جاسوس سر ہنری پوٹینگر (Sir Hunery Pottinger) بلوچستان میں
داخل ہوا 35 تو اسی دن سے بلوچ قوم کو تقسیم کرنے اور انھیں نسلی تاریخ اور ماخذ کے تلاش میں ایک

لا حاصل بحث میں ڈالنے کا عمل شروع ہو گیا۔ وگرنہ بلوچوں نے تو ماضی سے ہی ایک آزاد منش
سپاہی اور وطن پرست کی حیثیت سے زندگی گذاری ہے۔ اس نے کبھی بھی اپنی ذات کو بلوچ کے
علاوہ کسی اور قومیت یا فکر میں تقسیم نہیں کیا۔ بلوچ، لفظ بلوچ کو قوم کم اور نظریہ وفکر زیادہ سمجھتی ہے اسی
وجہ سے آج تک اس نے اپنے وجود کو برقرار رکھا ہوا ہے دوسری بات یہ کہ خوانین قلات جو قمبرانی
خاندان سے تعلق رکھتے ہیں یعنی میروانی اور احمد زئی 1410ء سے لیکر 1948ء تک ان دو
خاندانوں نے بلوچستان پر اپنے قبائل کے ساتھ ملکر حکومت کی مگر انھوں نے کبھی بھی اپنے نام کے
ساتھ خان براہوئی نہیں لکھا ہمیشہ خان بلوچ لکھتے رہے ان کی قبروں کے کتبوں پر بھی خان بلوچ
کندہ ہے حالانکہ ان کا تعلق براہوئی زبان بولنے والے بلوچ قبائل سے ہے اور تیسری بات یہ کہ
بلوچ سمیت کسی بھی قوم کو زبان کے اعتبار سے تقسیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ایک قوم میں بیک وقت کئی
زبانیں بولی جاتی ہیں مقامی سطح پر دیکھا جائے یا عالمی سطح پر ہر طرف ایک قوم میں بیک وقت کئی
زبانیں دیکھنے کو ملیں گی۔ بلوچوں میں بھی بیک وقت کئی زبانیں بولی جاتی ہیں جن میں قابل ذکر
بلوچی، براہوئی، سرائیکی، دہواری اور جٹکی (سندھی) ہیں لہٰذا برطانوی سوچ اور مفادات کو ایک
طرف رکھ کر قوموں کی تاریخ پر ایک نظر ڈالی جائے یا موجود دور میں قوموں کا مطالعہ کیا جائے تو
ہمیں زبانوں کی یہی صورتحال نظر آئے گی۔ لہٰذا ڈینس برے کے نظریے اور سر ٹی ہولڈچ کے
الفاظ سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا یہ محض اتفاق ہے کہ براہوئی زبان اور دراوڑوں کی زبانوں میں چند
الفاظ کی مماثلت پائی جاتی ہے اس کے علاوہ دراوڑوں میں بھی بیک وقت کئی زبانیں بولی جاتی
ہیں اور ان تمام زبانوں کے اکادکا الفاظ براہوئی زبان میں نظر آتے ہیں اسے صرف اتفاق ہی کہا
جا سکتا ہے ورنہ یہ کوئی نسلی یا مکمل لسانی تعلق نہیں ہے اور سب سے اہم ترین بات یہ کہ قوم تاریخ کے
ارتقائی عمل سے وجود میں آتی ہے صرف لسانی تفریق یا یکسانیت ہی اسکی بنیاد نہیں ہوتی۔ علاوہ
ازیں براہوئی قبائل کی موجودگی اور جھلاوان کے پہاڑوں میں ان مساکن کی تصدیق قدیم یونانی
مؤرخ ایرین بھی کرتا ہے اور بعد کے زمانے میں آنے والے مؤرخ سٹر یبو بھی ایرین کے بیان کو
صحیح تسلیم کرتا ہے اور اسی طرح میک کرنڈل اور ونسنٹ اے سمتھ بھی اپنی تصانیف میں ایرین کے
بیان کی تصدیق کرتے ہیں۔ ایرین لکھتا ہے کہ جب سکندر نے بٹالہ سے اپنی فوج کو تین حصوں میں
تقسیم کیا اور کریٹیریس کو براستہ مولہ، نیرخس کو براستہ سمندر کی جانب ایران روانہ کیا جبکہ خود ایک

لشکر جرار لیکر براستہ بیلہ ومکران عازم ایران ہوا۔ وہ جوں ہی سندھ سے بلوچستان کے حدود میں پہنچا تو دریائے پورالی کے قریب اس کا سامنا اربوئی قبائل سے ہوا جو بلا مزاحمت اپنے پہاڑی مساکن کی جانب فرار ہوئے۔ ان کا دریا (پورالی) اربیس کہلاتا تھا۔ جبکہ ان کے پہاڑ اور قبائل اربوئی کہلاتے تھے۔36

ایرین کا بیان 2ہزار تین سو سال قدیم ہے اور وہ اس خطے میں اربوئی قبائل کی تصدیق کر کے پوٹینگر اور دیگر برطانوی جاسوسوں کی غلط بیانی کو واضح بھی کر رہا ہے اور ان کے براہوئی بلوچ تقسیم کی تردید بھی۔

راقم الحروف نے اس سلسلے میں بلوچستان یونیورسٹی کے شعبہ براہوئی کے جرنل کے پہلے شمارے میں ایرین کے اس بیان اور برطانوی سازشوں کے حوالے سے ایک تحقیقی مضمون بھی شائع کروایا تھا۔37 اس میں تفصیل کے ساتھ ایرین، سٹریبو، میک کرنڈل، ہیرلڈ لیم اور سمتھ کے بیانات اور اقتباسات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

برطانوی عزائم کا ذکر وقتاً فوقتاً ضرورت کے تحت ہوتا رہیگا بہر حال یہ حقیقت ہے کہ برطانیہ اپنے سیاسی، فوجی، اور معاشی مفادات ومقاصد کی خاطر اپنی پالیسی (Divide and Rule) پر بڑی کامیابی کے ساتھ رواں تھے چونکہ خود بلوچ مؤرخین نے بہت بعد میں تاریخ نویسی شروع کی لہٰذا اس وقت تک برطانوی نظریات یہاں قدم جما چکے تھے اور بلوچ مؤرخین انہی کی نظریات کی روشنی میں قلم آزمائی کرتے رہے۔ براہوئی، دہوار، سرائیکی، جاٹ اور بلوچی تمام تر زبانیں اور قبائل قدیم بلوچ قبائل کی چیدہ چیدہ شاخیں ہیں جنکا رشتہ ماقبل تاریخ سے اسی سرزمین کے ساتھ جڑا ہوا ہے اور یہ بنیادیں اتنی مضبوط ہیں کہ آرین حملہ آوروں سے لیکر موجودہ دور تک تقریباً ساڑھے تین ہزار سال کی یلغاریں میں بھی انھیں ان کے دشت وجبل سے بے دخل نہ کر سکے بڑی بڑی تہذیبوں نے ان سے جنم لیا ان کی حمایت سے پروان چڑھتے گئے عروج پا گئے اور فنا ہو گئے مگر ان عظیم تہذیبوں کے بیچوں بیچ ہونے کے باوجود نہ صرف نام بلوچ زندہ رہا بلکہ وہی قدیم سرزمین ہی ان کی جائے پناہ رہی جسے عالمی طاقتیں بطور گذرگاہ استعمال کرتے رہے اور آج بھی وہی سرزمین بلوچ ثقافت وتہذیب کا امین بھی ہے اور اسکی پناہ گاہ بھی۔

براہوئی بلوچ قبائل نے 538 سال بلوچستان پر حکومت کی انہی کے دور میں بلوچستان کے

بکھرے ہوئے شیرازے کو یکجا ہونا نصیب ہوا اس خاندان میں بڑے نامور خوانین گذرے ہیں جنکی بلوچ تاریخ میں خدمات سنہری حروف میں لکھے جاتے ہیں ان میں میر عمر میروانی، میر میرو قمبرانی، میر احمد قمبرانی، میر محراب خان احمد زئی، میر عبداللہ خان احمد زئی، نصیر خان اعظم، میر محراب خان شہید، میر خدائیداد خان اور میر احمد یار خان وغیرہ آج بھی مذکورہ خوانین کی قبروں کے کتبوں پر ان کے نام کے ساتھ خان بلوچ لکھا ہوا ہے نہ کہ خان براہوئی۔ ایک عام براہوئی خاندان میں بلوچی عام طور پر سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ لہٰذا دراوڑی نظریہ کو برطانوی استعماریت کی ایک سیاسی چال ہی سمجھی جاسکتی ہے۔

خوانین قلات بھی جانتے تھے کہ برطانوی شاطر بھی انھیں عربوں اور ایرانیوں کی طرح مختلف گروہوں میں تقسیم کر کے اپنے مکروہ عزائم حاصل کرنا چاہتے ہیں لہٰذا خوانین بلوچستان نے ان انگریزی عزائم کو زیادہ پنپنے کا موقع نہ دیا لیکن چونکہ انگریز فاتح تھے لہٰذا فاتح نے اپنی نوک شمشیر کو خون بلوچ میں ڈبو کر انھیں براہوئی اور بلوچ میں تقسیم کرنے کی کوشش کی نہ صرف یہی بلکہ بلوچوں کو بھی نجانے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ بجائے اپنے دور کے عالمی طاقت نے تحقیقی راستہ اختیار کرنے کی انتہائی بھونڈے اور مضحکہ خیز انداز میں بلوچ نسلی اصلیت کی تاریخ لکھ کر آنے والے بلوچ مورخ اور محقق کو ایک لاحاصل بحث میں ڈالا۔ ان برطانوی شاطروں اور جاسوسوں نے بلوچ نسلی اصلیت کے بارے میں نظریات کے انبار لگا دیئے تاکہ آنے والا بلوچ محقق اپنے اصل مسکن سے بیگانہ رہے اور ہمیشہ اسکی تلاش میں سرگرداں رہے لہٰذا کوئی انھیں حلبی کہتا ہے تو کوئی بحیرہ خزر سے آنے والا، کوئی آرین تو کوئی عرب۔

صرف زبان میں تھوڑے سے اختلاف کو بنیاد بنا کر کسی قوم کو اس کے کل سے جدا نہیں کیا جاسکتا بلوچوں میں اب بھی کئی زبانیں بولی جاتی ہیں ان تمام کا تعلق زمانہ قدیم سے بلوچستان سے رہا ہے، سرائیکی زبان کو پنجاب میں متعارف کرانے کا سہرا بھی انہی بلوچ قبائل کو جاتا ہے جو پنجاب کے ایک وسیع رقبے پر آباد ہیں یہ قدیم ہوت اور رند قبائل کی اولاد ہیں جو پنجاب اور خیبر پختون خواہ کے ایک وسیع رقبے پر قابض ہوئے تھے یہ پاکستان کے مختلف علاقوں ڈیرہ غازی خان، لیہ، بھکر، راجن پور، تونسہ، ساہیوال، صادق آباد، رحیم یار خان، ملتان وغیرہ میں لاکھوں کی تعداد میں آباد ہیں ان کے نامی گرامی قبائل میں ہوت، قیصرانی، بزدار، چانڈیا، دریشک، لنڈ، دشتی،

لغاری، کھوسہ، گورچانی، رنداور دیگر بے شمار قبائل شامل ہیں۔

سرائیکی زبان کی طرح براہوئی زبان بھی وقت اور حالات کی پیداوار ہے وگرنہ ان کے تمام تر معاشرتی ادارے اور معاشی ذرائع ایک جیسے ہیں۔ ان کے اداروں اور ذرائع میں ایران کے دشتوں سے لیکر کوہ سلیمان تک مکمل مماثلت پائی جاتی ہے لہٰذا براہوئی قبائل بلوچ ہیں اور ایشیاء کی ایک اہم گذرگاہ پر آباد ہیں اور بلوچ سرزمین کے انتہائی اہم چوکیوں کے نگران ہیں۔

اس حوالے سے کہ براہوئی بلوچ یا دھوار وغیرہ کون ہیں، ملک سعید دہوار، جو کہ بلوچستان کے ایک کہنہ مشق سیاست دان، قبائلی رہنما اور کئی تاریخی کتب اور مضامین کے مصنف تھے، نے ایک بار پڑنگ آباد مستونگ میں اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ۔

''ہم اپنے گھر میں دہوار، محلے میں براہوئی اور ملک میں بلوچ ہیں، اور یہی ہماری پہچان ہونی چاہیے۔''

کرنل موکلر (Col. Mockler) اور ہیوز بلر (Huges Buller) کے خیال میں بلوچ مکران کے قدیم اور اصل باشندے ہیں اور لفظ بلوچ یونانی لفظ گیڈروشیا یا گیڈروش سے بگڑ کر بلوچ بنا ہے کیونکہ ان کے خیال کے مطابق، یونانی لفظ گیڈروش کا بلوچی زبان میں مطلب ہوتا ہے بدروچ (برے دن) کے۔ وہ لفظ بدروچ کو بلوچ لفظ کا اصل سمجھتے ہیں۔ 38 وہ رندوں کو علافی عرب لکھتے ہیں جو بحیرین سے آکر اس خطے میں آباد ہوئے تھے اور عرب حملوں کے دوران انہوں نے مقامی راجاؤں کا ساتھ دیا تھا۔

جہاں تک موکلر اور ہیوز بلر کے اس نظریے کا تعلق ہے کہ بلوچ مکران کے قدیم باشندے ہیں میں کوئی شک نہیں بلکہ بلوچ زمانہ قدیم سے پورے بلوچ خطے میں آباد ہیں اور جہاں تک لفظ گیڈروش کا تعلق ہے تو اس میں کوئی حقیقت نہیں کیونکہ یونانیوں کی آمد سے قبل بلوچ، بلوچ کہلاتے تھے اور انھوں نے ہخامنشیوں کی سرکردگی میں یونانیوں کے ساتھ جنگیں بھی لڑی تھیں اور جہاں تک رندوں اور علافیوں کے آپس کے تعلق کا سوال ہے تو اس میں کوئی حقیقت نہیں بلکہ تاریخی حقائق یہ ثابت کرتے ہیں کہ علافی، سندھی راجاؤں کی عربوں کے ہاتھوں شکست کے آثار دیکھ کر کشمیر کے راجہ کے پاس پناہ گزین ہوئے تھے۔ 39 دوسری بات یہ کہ حارث علافی کا خاندان کتنا بڑا تھا کہ وہ کچھ عرصہ میں اتنی عظیم قوت بن گیا کہ جسکا ایک حصہ رند دوسرا لاشار تیسرا ہوت اور چوتھا

کورائی کہلاتا ہے اور جو کچھ ہی عرصے میں لاکھوں تک پہنچ گئے اور سینکڑوں قبائل میں تقسیم ہو گئے۔ اس دلیل میں کوئی وزن اور حقیقت نہیں اور نہ ہی یہ کوئی محققانہ بات ہے کہ خالص بلوچ قبائل کا تعلق عربوں کے ساتھ بغیر کسی تاریخی اور تحقیقی ثبوت کے جوڑا جائے۔

مولانا عبداللہ دھرمانی اور قاضی عبدالصمد سر بازی بلوچوں کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں۔

" کہ بلوچ مکران کے قدیم باشندے ہیں اور وہ حضرت نوحؑ کے پوتے فارک بن سام بن نوح کی اولاد ہیں جس کے ایک بھائی کا نام مکران بن سام بن نوحؑ تھا اور اس کا دوسرا بھائی کرمان بن فارک بن سام بن نوحؑ تھا۔ بابل میں جب زبان بٹ گئے تو حضرت کرمان، کرمان میں اور حضرت مکران, مکران میں آباد ہو گئے اور حضرت مکران نے بلوچی زبان کو متعارف کروایا جو آج تک مکران میں رائج ہے 40"

برطانوی مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والوں کا ایک طبقہ بلوچوں کو نسلاً ایرانی نسل خانہ بدوش سمجھتے ہیں ان میں لانگ ورتھ ڈیمز (Long Worth Dames)، ایوانوف (Ivanov) اور برٹن (Burton) شامل ہیں۔ ڈیمز کے خیال میں بلوچ آریائی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور انھوں نے شمالی ایران یعنی بحیرہ خزر (بحیرہ کیسپیئن) کے جنوبی ساحلوں سے ہجرت کی تھی۔ مشہور روسی ماہر لسانیات (L.W Ashanin) بھی ڈیمز کی پیروی کرتا ہے 41 جبکہ برٹن اور ایوانوف بھی قریب قریب یہی نظریہ رکھتے ہیں۔ ڈیمز کے خیال میں بلوچوں نے پانچوں صدی عیسوی میں سفید ہنوں کے حملوں کے نتیجے میں بحیرہ خزر (Caspian Sea) کے ساحلوں سے ہجرت کی۔ اس بات میں شک نہیں کہ بلوچ بحیرہ خزر کے آس پاس ایک وسیع علاقے میں آباد تھے مگر اس بات میں صداقت نہیں کہ سفید ہنوں کے حملوں کے نتیجے میں وہاں سے ہجرت کی تھی کیونکہ اولاً بلوچ سفید ہنوں سے قبل بحیرہ خزر سے ساحل مکران تک آباد تھے اور دوسری طرف ایلان و گیلان کے ایرانی صوبوں کے علاوہ کرمان سے بولان تک آباد تھے اور ایک مضبوط جمیعت رکھتے تھے۔ اور دوئم یہ کہ انھوں نے نوشیروان حاکم ایران کے ساتھ مل کر سفید ہنوں کو ایرانی حدود سے نکال باہر کیا تھا۔ تب جا کر ہنوں نے یورپ اور ہندوستان پر یلغار کر دی۔ دراصل بلوچ زمانہ قدیم میں اولین ایرانی

خاندان پیش دادی یاGothians کے دور میں 2100ق م سے 854ق م تک ایرانی افواج میں
رہے اور ایک وسیع سرحد کی حفاظت پر مامور تھے۔ اس زمانے میں سیستان پر ناہروئی بلوچوں کی
سیادت قائم تھی۔42 آرین حملوں کے دوران یہی وہ قبائل تھے جنہوں نے صدیوں تک حملہ آور
آرین اقوام کا مقابلہ کیا اور انھیں ایرانی سرحد میں داخل ہونے سے روکے رکھا۔☆43 بعد ازاں
میدیوں (Medians) کی حکومت 854ق م سے 558ق م اور ہخامنشی دور اقتدار 558ق م
سے 331ق م تک بلوچ ایرانی اقوام کے شانہ بشانہ مختلف ممالک پر یلغار کرتے رہے حتیٰ کہ عرب
حملوں تک بلوچ البرز، بحیرہ خزر، کرمان، مکران اور موجودہ بلوچ علاقوں میں آباد تھے اور ایک
مضبوط جمعیت کے مالک تھے۔ ایران پر آرین حملوں اور بعد ازاں میدی اور ہخامنشی ادوار میں
بلوچوں کی اقامت گاہ کی بارے میں محمود غزنوی کے درباری شاعر ابوالقاسم فردوسی یوں رقم طراز
ہے۔

که نزدیک زابل به سی روزه راه
یکی کوه بوده سر کشیده به ماه
به یک سوئے او دشت خرگاه بود
دگر دشت زاه هند راه راه بود
نشد درآن دشت بسیار کوچ
زاوگان ولاچین و کرد و بلوچ 44

ان اشعار میں فردوسی واضح طور پر بلوچ آبادی کو بولان اور اس سے متصل تمام علاقوں میں
ظاہر کر رہا ہے جبکہ یہ زمانہ چھٹی صدی قبل مسیح اور اس سے قبل کا ہے۔ جہاں تک ہنوں کی ہجرت کا
تعلق ہے تو ان قبائل کی ہجرت پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں ہوئی اور یہ زمانہ ہخامنشی دور سے
ہزار سال بعد کے ساسانی عہد کا ہے لہٰذا سفید ہنوں کے حملوں کو بلوچ مہاجرت کی وجہ قرار دینا غلط
ہے بلکہ سفید ہنوں کو بلوچوں اور ایرانیوں نے سخت نقصان پہنچایا البتہ ان کے کچھ دھڑے بلوچستان
میں داخل ہو گئے اور بمرور زمانہ مقامی آبادی میں مدغم ہو گئے۔ ملک محمد سعید دہوار کا خیال ہے کہ
مینگل بلوچ قبائل کا تعلق انہی ہنوں سے ہے۔ مگر دونوں کے ناک نقشے میں کوئی یکسانیت نہیں
پائی جاتی۔45 مگر دونوں کے ناک نقشے میں کوئی یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ البتہ ہنوں کا زیادہ زور

وسط ایشیاء ہندوستان اور یورپ کی طرف رہا۔ ہنگری (Hungary) کا ملک انھوں نے ہی آباد
کیا۔46

اس کے علاوہ یہ کہ بلوچ نہ صرف بحیرہ خزر (Caspian Sea) کے جنوبی ساحلوں بلکہ کوہ
البرز کے دامن اس سے ملحق ایرانی صوبوں ایلان، گیلان اور مازندران میں بھی آباد
تھے۔47 مشرقی ایران میں دشت لوط اور کرمان کی مکمل آبادی ان پر مشتمل تھی۔48 علاوہ ازیں
مکران، 49 قلات خضدار، مستونگ اور بولان تک ☆50 ان کی کثیر آبادیوں کے سراغ ملتے
ہیں۔ ہنوں کے حملوں کے بہت زمانے بعد بھی بلوچ ایک وسیع و عریض علاقے پر قابض رہے۔
موجودہ دور میں نہ صرف بلوچ اپنے ابتدائی مساکن میں ہی رہ رہے ہیں بلکہ مشرقی سمت میں
سندھ و پنجاب سے بھی آگے ہندوستانی سرزمین تک پہنچ چکے ہیں۔ اسی طرح خلیجی عرب ممالک
میں بھی ان کی کثیر تعداد رہتی ہے۔ لہٰذا ڈیمز کی یہ رائے کہ بلوچوں نے البرز سے سفید ہنوں کے
حملوں کی وجہ سے ہجرت کی غیر حقیقی ہے البتہ البرز اور اس سے متصل ایرانی صوبوں میں 480ء
سے 531ء تک بلوچوں کی تباہ کن یورشوں اور حملوں کا ذکر شاہنامہ فردوسی میں تفصیل کے ساتھ
موجود ہے جس میں بلوچوں اور ساسانی حکمرانوں قباد اور اس کے بیٹے نوشیروان کے ساتھ
زبردست جنگوں کا تذکرہ موجود ہے۔ تقریباً 50 سالوں تک لڑی جانے والی اس طویل جنگ کے
بعد آخر کار بلوچ مغلوب ہوئے اور ان کی ایک بڑی اکثریت اپنے قدیم مساکن کوہ البرز سے نکل
گئی مگر جو اپنے مساکن میں رہے انہوں نے نوشیروان کی اطاعت قبول کی اور نوشیروان نے انہیں
ایلان و گیلان کے صوبوں میں آباد کیا۔51 سفید ہنوں (Apthilites) کا اصل وطن منگولیا تھا
ابتداء میں یہ سفید ہن وہاں آوار (Hurrians) قبائل کیساتھ ان کے ماتحت زندگی بسر کرتے تھے
پیشے کے لحاظ سے یہ گلہ بان اور چرواہے تھے اور لاکھوں کی تعداد میں مال مویشی اور بھیڑ بکریوں
کے مالک تھے۔ آوار قبائل سیاسی قوت کے مالک تھے اور ان گلہ بانوں سے جبراً ٹیکس لیتے تھے۔ یہ
ان کے مظالم سے تنگ آ کر 10 لاکھ خاندانوں کی صورت میں 360ء میں باختریا پر حملہ آور ہوئے
جہاں کداریوں کی حکومت قائم تھی۔ کداریوں کو انھوں نے جنوبی افغانستان کی جانب دھکیل دیا۔
یہی کداری جو چھوٹے کشان بھی کہلاتے ہیں انھوں نے افغانستان میں کشان حکومت کی بنیاد
رکھی۔ ہنوں نے باختریا پر قبضہ کر کے ایران پر حملے شروع کئے، ایک محدود مدت کیلئے ایران ان کا

باجگزار رہا لیکن نوشیروان نے 531ء کے بعد ہنوں اور ترک خاقان کے درمیان اختلافات سے فائدہ اٹھایا اور 566ء میں انھیں ثمر قند میں شکست دیکر ان کی قوت کو منتشر کر دیا۔52

سفید ہنوں کے وہ دھڑے جو وسط ایشیاء میں شکست کھانے کے بعد بلوچستان میں داخل ہوئے وہ یہاں کی قدیم آبادی میں ضم ہو گئے اب ان کا سراغ لگانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

مندرجہ بالا تمام واقعات اور جنگ بلخ و بخارا کا تفصیل کے ساتھ تذکرہ بلکہ پوری تاریخ شاہنامہ فردوسی میں موجود ہے۔ اس جنگ کا فردوسی نے منظوم انداز میں احاطہ کیا ہے جس میں بلوچوں کی ایک کثیر تعداد نے سپہ سالار گاہو (گاور، گہور، گاہی خالص بلوچی نام ہیں) کی سربراہی میں اس جنگ میں بھر پور حصہ لیا تھا۔ لہٰذا بحیرہ کیسپیئن سے بلوچوں کے انخلاء کی بات کرنا ایک تاریخی غلطی ہے اور ایک اہم تاریخی واقعے کو کسی اور واقع سے منسلک کرنا اس سے بھی بڑی غلطی ہے۔ مندرجہ بالا علاقوں میں بلوچوں کی موجودگی کے تذکرے عرب دور کے روزناموں اور تاریخوں میں ملتے ہیں۔ مؤرخین موجودہ دور میں بھی ان علاقوں میں بلوچوں کی کثیر آبادی کا تذکرہ کرتے ہیں۔53

اس طویل تاریخ کے بیان کرنیکا مقصد یہ ہے کہ یہ واضع کیا جا سکے کہ بلوچ قبائل ہنوں کے حملوں سے قبل بھی بحیرہ کیسپیئن کے ساحلوں پر آباد تھے البتہ وہاں سے ان کی ایک بڑی آبادی بمرور زمانہ مختلف وجوہات کی بنا پر اندرون ایران اور وسط ایشیاء سمیت روس کے آباد اور خوشحال علاقوں کی طرف بڑھتے گئے جنھیں آج شناخت کرنا جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔ ڈاکٹر بیلیو (Dr. Bellew) ایک مضحکہ خیز اور بے بنیاد نظریہ پیش کرتے ہوئے بلوچوں کو ہندوستانی نسل راجپوت لکھتا ہے۔

"لفظ بلوچ ہندوستانی راجپوتوں کے ایک قبیلہ "بل اوچھا" کے ہم وزن ہے" 54

مگر اس نظریے کی بھی کوئی تاریخی اہمیت نہیں ہے صرف ایک لفظ کی مماثلت سے اس بے بنیاد نظریے کو قائم کیا گیا ہے۔

پروفیسر کین (Prof.Keen) بلوچوں کو تاجک لکھتا ہے۔55 مگر یہ بھول جاتا ہے کہ بلوچوں اور تاجکوں میں کتنا فرق پایا جاتا ہے چہرے مہرے سے لیکر اداروں اور پیشوں تک میں

مکمل تفریق پائی جاتی ہے یہ نظریہ بھی کسی تبصرے یا تنقید کے لائق نہیں۔

ہنری پوٹینگر (Henery Pottinger) انھیں ایرانی النسل لکھتا ہے اور عربی نظریے کی شدید مخالفت کرتا۔56 ترکمان اور بلوچ ماضی قدیم میں ایک دوسرے کے ہمسائے میں رہتے تھے مگر نسلاً ان کا تعلق یکساں نہیں ہے۔

انگریزوں کے بلوچ اصلیت پر نظریات کی بھر مار سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کتنے شاطر اور تیز طرار تھے۔ انھوں نے سادہ لوح بلوچ قبائل کو ایسے غیر ضروری مباحث میں پھنسایا کہ جس نے انھیں اپنے ہی تلاش میں سرگرداں کر دیا۔ انھوں نے بلوچ تاریخ پر ایک ایسی کاری ضرب لگائی کہ دو سو سالوں سے ہم اپنی تلاش میں ہیں لیکن ہمیں اپنا کھوج نہیں مل رہا۔ اسکی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انگریز توسیع پسند تھے فاتح تھے وہ افغانستان اور بلوچستان سمیت ایران پر قابض ہو کر روس کو بلوچستان کے گرم سمندر سے دور رکھنا چاہتے تھے دوسری طرف روس کی بھی یہی خواہش تھی کہ کسی طرح ساحل مکران پر اسکا قبضہ ہو جائے اور وہ یہاں سے برطانیہ کی ہندوستانی مقبوضات کیلئے ایک مستقل خطرہ بنا رہے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی میں عالمی طاقتوں کے مابین کھیلے جانے والے اس کھیل میں بلوچستان مرکزی نقطے کی حیثیت رکھتا تھا۔

روسی خطرے سے نمٹنے کیلئے برطانیہ اٹھارویں صدی کے اختتام اور انیسویں صدی کے آغاز میں ہی بلوچستان کی طرف اپنی توسیع پسند پالیسی کو آگے بڑھانے کا منصوبہ تشکیل دے کر اس پر عملدرآمد شروع کر چکا تھا لہٰذا اس مقصد کی خاطر ایک جاسوسی مہم 1810ء میں بلوچستان کے مختلف حصوں کی طرف روانہ کی گئی۔ اس مہم میں لیفٹننٹ ہنری پوٹینگر (Lt Hunery Pottinger) کیپٹن کرسٹی (Cap.Christi) اور کیپٹن گرانٹ (Cap. Grant) شامل تھے۔ سکندر اعظم کے بعد ہنری پوٹینگر پہلا یورپی تھا جو بلوچستان میں وارد ہوا اور برطانوی اقتدار کی پہلی اینٹ رکھ دی۔ 1839ء میں سقوط قلات کے بعد برطانوی ایجنٹوں، جاسوسوں، فوجی افسروں اور پولیٹیکل انتظامیہ کے افسروں نے بھی اپنے مورچوں یا ریسٹ ہاوس میں بیٹھ کر بلوچوں کی تاریخ پر طبع آزمائی شروع کی۔ لہٰذا جسکا جو جی میں آیا لکھتا گیا جو چاہا نظریہ پیش کیا۔ یقیناً یہ سب کچھ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا جا رہا تھا جس کے اثرات بلوچ قوم آج بہتر انداز میں محسوس کر رہی ہے کہ وہ اپنی اصل شناخت سے ناآشنا اور انہی انگریزوں کے نظریات کی روشنی

میں غلط مفروضے قائم کر رہے ہیں اور بلوچوں کی تاریخ کو مزید گنجلک بنا رہے ہیں۔

میر گل خان نصیر مرحوم بلوچ تاریخ بلوچی ادب اور بلوچستانی سیاست میں ایک اعلیٰ مقام رکھتے ہیں ان کی بلوچ سیاسی تاریخ اور بلوچی ادب پر بہت ساری کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں وہ بیشتر کتابوں کے مترجم بھی تھے۔ بلوچی تاریخ لکھتے وقت وہ بلوچوں کے بارے میں درج ذیل نظریہ پیش کرتے ہیں۔

"بلوچ زمانہ قدیم سے عربستان میں دجلہ و فرات کی وادیوں اور حلب کے مرغزاروں میں ایرانی سرحد کے ساتھ ساتھ آباد تھے۔ ایران میں تبریز سے کوہ البرز اور مشہد تک پھیلے ہوئے تھے۔ مال و مویشی پالنا اور گردو نواح کے زرخیز و شاداب علاقوں، آبادیوں اور شہروں کو لوٹنا ان کا مرغوب مشغلہ اور پیشہ تھا۔ شاہنامہ فردوسی میں ایک واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ نوشیروان شاہ ایران کے زریں عہد 531ء میں بلوچ کوہ البرز جسے فردوسی شاہنامہ میں برزکوہ لکھتا ہے کے گردو نواح میں آباد تھے۔ ایک دفعہ ان کی تاخت سے تنگ آ کر ایران کے دہقان نوشیروان کے پاس فریاد لیکر گئے اور بقول فردوسی نوشیروان خود ایک جرار لشکر کے ساتھ بلوچوں کی سرکوبی کو نکلا اور ان پر فرار کے تمام راستے مسدود کر کے اس نے اپنی سپاہ کو بلوچوں کے قتل عام کا حکم دیا مرد عورت بچے بوڑھا اور جوان جو بھی سامنے آیا تہہ تیغ ہوا بے شمار بلوچ تہہ تیغ ہوئے اور جو زندہ بچے وہ مال مویشی گھربار چھوڑ کر ایسے بھاگے کہ پھر کبھی وہاں کا رخ نہ کیا"57

مزید لکھتے ہیں کہ یہی طائفہ میر کمبر کی سرکردگی میں سیستان، رودبار، چاغی اور خاران سے ہوتا ہوا اراپ، سیاہ کنب اور جھالاوان کے پہاڑوں میں آ کر رکا اور بروکوئی کہلانے لگا جو بعد ازاں بگڑ کر براہوئی میں تبدیل ہوا۔58

دوسرے طائفے کے بارے میں یوں رقم طراز ہے کہ۔

دوسرا طائفہ جو دجلہ و فرات کی وادیوں اور حلب کے مرغزاروں میں آباد تھا گردش زمانہ سے تنگ نہ ہو سکا۔ خلفائے راشدین کے بعد جب بنو امیہ کے خلیفہ یزید بن معاویہ اور حضرت امام حسینؓ

کے درمیان معرکہ کربلا گرم ہوا۔ کہتے ہیں کہ بلوچ قبائل نے اس جہاد میں حضرت امام حسینؓ کی مدد کی اور آخر کار حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے بعد یزید اور ابن زیاد کے خوف انتقام سے ہراساں ہو کر یہ بلوچ قبائل میدانی علاقوں کو چھوڑ کر حلب کے پہاڑوں میں پناہ گزیں ہوئے اور گذارہ معاش کیلئے زیریں آبادیوں اور شہروں کو لوٹتے اور غارت کرتے رہے تا آنکہ بنو امیہ کے خونی اور سفاک گورنر حجاج بن یوسف نے تنگ آ کر بلوچوں کو بھی عراقیوں اور کوفیوں کے ساتھ تہہ تیغ کرنے لگا۔ بلوچوں میں حجاج بن یوسف جیسے ایک باجبروت گورنر سے مقابلے کی طاقت نہ تھی مجبوراً ان کو پہاڑوں سے بھی ہجرت کرنا پڑا۔59

اس طائفے کی مزید وضاحت کرتے ہوئے مذکورہ مصنف لکھتا ہے کہ

"سردار جلال خان کی سرکردگی میں بلوچوں کے چوالیس (44) قبیلے حلب سے ہجرت کر کے ایران آئے اور بمقام جفین سکونت پذیر ہوئے چونکہ ان قبائل کا مال و متاع حجاج بن یوسف کی غارت گری کی بھینٹ چڑھ چکا تھا اور ان کا گذارہ معاش تنگ تھا اس لئے یہاں پر بھی ان بلوچوں کو لوٹ مار کا پیشہ ہی اختیار کرنا پڑا۔ کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں بدرالدین نامی ایک شخص ایران کے حکومت کی جانب سے اس علاقے کا حاکم تھا اس نے بلوچوں کی سرکوبی کو لشکر نکالا اور جفین کے مقام پر بلوچوں کو شکست دیکر حدود ایران سے نکال دیا" 60 بعد ازاں:

"میر جلال خان کی قیادت میں یہ قبیلہ مکران میں آ کر آباد ہوا میر جلال کے چار بیٹے رند، لاشار، ہوت، کرا اور ایک بیٹی جتو نامی تھی۔ میر جلال کے بعد متفقہ طور پر میر رند اس کا جانشین بنا اور یہ طائفہ رند کے نام سے مشہور ہوا۔61"

تیسرے طائفے کے بارے میں مصنف رقمطراز ہے:

مکران کی سرحد سے بندر عباس تک، چاغی کی سرحد سے سیستان تک اور افغانی اور ایرانی سرحدات کے ساتھ ساتھ ہرات تک بلوچوں کا ایک اور طائفہ قدیم زمانے سے آباد چلا آتا ہے جس کو عرف عام میں ناروئی (ناہروئی) بلوچ کہتے ہیں۔62

ملک صالح محمد خان لہڑی بھی اپنی تصنیف "بلوچستان ون یونٹ سے پہلے" میں 63 اور پروفیسر محمد اشرف شاہین قیصرانی اپنی کتاب "بلوچستان تاریخ و مذہب" 64 میں میر گل خان نصیر

کے نظریے کی تائید کرتے ہیں۔ بریگیڈیئر اسماعیل صدیقی بھی بلوچوں کو حلب سے آنے والا قافلہ لکھتا ہے اور کربلا کے واقع میں ان کی موجودگی کی تائید کرتا ہے اور ساتھ ہی بلوچی زبان کے منظوم داستانوں کی روشنی میں بلوچوں کو امیر حمزہ کی اولاد لکھتا ہے۔65

میر گل خان نصیر نے بلوچوں کے آبائی وطن کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ نہ صرف مختصر بلکہ غلط بھی ہے اس کے علاوہ انھوں نے بلوچوں کی نسلی تحقیق یا ماخذ کے متعلق کوئی حرف تحریر کی ہی نہیں بس انھیں مختلف علاقوں میں منتشر اور بکھری ہوئی حالت میں بیان کیا ہے اور ساتھ ہی انھیں ڈاکو، خانہ بدوش اور لٹیرا لکھا ہے انھوں نے ان کے کوہ البرز سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے بے دخل ہونے کا بھی ذکر کیا ہے۔

بلوچ جغرافیہ اور تمن خانئوں پر آگے بحث ہوگی پہلے ان باتوں کی وضاحت کی جائے گی جن میں میر صاحب نے بلوچوں کو ڈاکو، خانہ بدوش، عہد نوشیروان میں ان کی بے کسانہ قتل اور کوہ البرز سے بے دخلی کا ذکر کیا ہے۔

میر گل خان نصیر نے جس شاہنامے کے حوالے سے مندرجہ بالا الفاظ اپنی کتاب میں رقم کی ہیں اسی شاہنامے میں بلوچوں کو ابوالقاسم فردوسی نے جن الفاظ میں یاد کیا ہے وہ الفاظ ہی میر صاحب کے ان باتوں کی نفی کرتے ہیں کہ بلوچ لٹیرے یا خانہ بدوش تھے۔

سپاہی ز گردان کوچ و بلوچ۔ سگالیدہ جنگ مانند قوچ

فردوسی کے اس ایک شعر سے ہی اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ بلوچ ڈاکو نہیں بلکہ سپاہی تھا ایک ایسا سپاہی جو شاہان ایرن کی فوج میں اعلیٰ وارفع مقام رکھتا تھا۔ بلوچ خانہ بدوش بالکل نہیں تھا کیونکہ ایک خانہ بدوش اور ڈاکو کو کسی عظیم سلطنت اور کسی عظیم شہنشاہ کی فوج میں ہراول دستے کا سپاہی بننے کا اعزاز نہیں مل سکتا اور وہ بھی اس زمانے میں جب ایران میں بدترین ملوکیت کا جابرانہ نظام قائم تھا۔ ایک خاندان کے بعد دوسرا خاندان اس کے بعد تیسرا اور پھر مزید ملوکیت۔

ان حکمرانوں کے ہراول دستوں میں بلوچوں کو جو امتیازی حیثیت حاصل تھی وہ شاید شاہی خاندان کے افراد کو بھی حاصل نہ تھا حتیٰ کہ ایران کے میدی، ہخامنشی، آشکانی اور ساسانی خاندانوں کے عہد تک بلوچ بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ گو کہ تاریخ میں انتظامی (Civil\Administrative) عہدوں یا عہدیداروں کا تذکرہ نہیں ملتا لیکن فوجی کارناموں سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ جہاں ان کی ایران کیلئے فوجی خدمات تھیں تو وہاں یقیناً

سول خدمات بھی ہونگے۔ تاریخ کے صفحات پر ان کا ذکر کیوں نہیں ہے اسکی یقیناً یہی توجیہہ ہوسکتی ہے کہ ایران میں چونکہ کبھی کوئی جمہوری حکومت قائم نہیں ہوئی تھی اور ایرانی عوام انتہائی شدید اور جابرانہ ملوکیت کا شکار تھے اور ایرانی شہنشاہ اپنی مضبوط فوجی قوت کے بل بوتے پر زمام حکومت سنبھالے ہوئے تھا۔ ایران میں مضبوط فوج موجود تھی حکمرانوں کے عزائم ہمیشہ سے توسیع پسندانہ رہے تھے۔ ایران کی تاریخ میں اسی وجہ سے صرف فوجی کارناموں کا تذکرہ ملتا ہے۔ ابتلا کے اس شدید اور بدترین ملوکانہ دور میں کسی ظالم اور جابر شہنشاہ کے دربار اور عظیم فوج تک رسائی حاصل کرنا اور اعلیٰ عہدے لینا واقعی ایک بڑا کارنامہ تھا جو یقیناً کسی خانہ بدوش کیلئے مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا اور اب بھی ہے۔

رہی بات ڈاکہ زنی کی تو ایران اور روم کی نہ ختم ہونے والی جنگوں اور ایران کے توسیع پسند حکمرانوں کی فوج کشیوں اور یلغاروں سے بلوچوں کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ ڈاکہ زنی اور رہزنی کرتے۔ پاکستان کے مایہ ناز مصنف سید سبط حسن لکھتے ہیں کہ "بلوچوں کے ایک لشکر نے تھرماپلے (یونان) کے مقام پر 480 ق م میں ایرانیوں کے دوش بدوش یونانی (ایتھنز) کی افواج پر حملہ کیا" 66 اب اتنی مصروف زندگی اور وہ بھی ایک شہنشاہ کے فوجی بھلا ان کے پاس اتنی فرصت ہی کہاں تھی کہ وہ لوٹ مار کرتے اور رہزنی کرتے لہٰذا میر گل خان نصیر کا یہ کہنا کسی طور درست نہیں کہ بلوچ ڈاکو اور راہزن تھے۔ اس کے علاوہ خانہ بدوشانہ زندگی کی بجائے وہ مدنیت کے قائل اور عادی تھے۔ جس طرح پہلے ذکر ہوا کہ بلوچ ایرانی افواج میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے اور ہراول دستے کی کمان کرتے تھے اس کے علاوہ ہر وقت میدان کارزار میں مصروف پیکار رہتے تھے لہٰذا دعوئی کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ شہری زندگی سے آشنا تھے اسی وجہ سے وہ ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے ان اعلیٰ عہدوں تک پہنچے تھے۔ خانہ بدوش زندگی میں یہ سب ممکن نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ ابوالقاسم فردوسی خود بھی ان کی مدنیت کے قائل ہیں اسی لئے وہ انھیں کبھی کوہ البرز میں سکونت پذیر بتاتا ہے اور کبھی کوہ چلتن کی وادیوں میں۔ کوہ البرز کے حوالے سے وہ لکھتا ہے کہ وہاں کے بلوچ قریبی صوبوں کیلئے بلائے ناگہانی بن کر نازل ہوئے اور ایلان و گیلان کے صوبے تباہ و برباد ہو گئے تب نوشیروان نے ان پر مسلح حملے شروع کئے اور ان کی آبادیوں کو تاراج کیا۔ 67 جبکہ کوہ چلتن کے آس پاس ان کی موجودگی کا ذکر بحیثیت تورانی فوج کے ایک سپاہی کے کرتا ہے لکھتا

ہے کہ:

کہ نزدیک زابل بہ سی روزا راہ	یکے کوہ بود سر کشیدہ بہ ماہ
بہ یک سوئے او دشت خرگاہ بود	دگر دشت زا ہند را راہ بود
نشتند در آں دشت بسیار کوچ	زاوگان ولاچین وکرد و بلوچ 68

جہاں تک کوہ البرز (فردوسی نے اسے بزرکوہ لکھا ہے) پر ایرانی فوجکشی اور بلوچوں کے قتل عام کی بات ہے تو یہ بھی شاہنامہ میں منظوم ہے۔ ہمارے مؤرخین نے شاہنامہ کے الفاظ کو جن میں ایرانی دہقان شہنشاہ ایران نوشیروان سے شکایت کرتے ہیں کہ بلوچ انھیں لوٹ کھسوٹ رہے ہیں لہٰذا اس اندرونی انتشار اور لاقانونیت کا ازالہ کیا جائے۔ دیگر بلوچ مؤرخین کی طرح میر گل خان نصیر نے بھی من وعن تسلیم کیا کہ واقعی بلوچ ڈاکوؤں کی طرح ان دہقانوں کو لوٹتے ہیں اور دیہاتوں پر حملہ آور ہوتے ہیں۔

دراصل ابوالقاسم فردوسی بذات خود ایرانی نسل تھا لہٰذا ایک ایرانی شاعر یہ کبھی نہیں چاہتا کہ جو قوم اسکے آباؤ اجداد کیلئے لڑتی رہی ہے وہ قوم اپنے آقاؤں سے باغی ہو۔ یقیناً نوشیروان سے قبل اس کے والد قباذ کے دور میں ہی بلوچوں کی عظیم بغاوت کا آغاز ہوا تھا اسی وجہ سے بقول فردوسی کے نوشیروان کو اس کے مشیروں نے مشورہ دیا کہ بلوچوں کی بغاوت فرو کرنے کا خیال دل سے نکال دے کیونکہ آپ سے قبل آپ کے والد قباد نے بھی اس بغاوت کو کچلنے کیلئے اپنی تمام تر توانائیاں صرف کیں لیکن اس بغاوت کا قلع قمع نہیں کر سکا۔ 69

480ء میں ہونے والی اس بڑی بغاوت کی دو وجوہات تھیں۔ ان میں ایک مذہبی نوعیت کا تھا جبکہ دوسری وجہ خالص سیاسی نوعیت کا تھا۔ مذہبی وجہ تو یہ تھی کہ قباذ کے دور میں اشتراکی مبلغ مزدک کا ظہور ہوا اور اس نے قباذ کو مزدکی عقیدے میں آنے کی دعوت دی لہٰذا قباذ نے اس کے عقیدے کو قبول کیا اور آتش پرستوں کے زرتشتی عقائد چھوڑ دیئے۔ 70 جبکہ دوسری وجہ قباذ کے بھائی طہماسپ کی بغاوت تھی۔ 71 قباذ کے مزدکی عقیدے کی قبولیت کو بلوچوں نے پسند نہیں کیا اور وہ طہماسپ سے جا ملے اور اس بغاوت میں اسکا ساتھ دیا۔ طہماسپ نے بلوچوں کی مدد سے 498ء میں ایران کے تاج وتخت پر قبضہ کر لیا۔ 72 مگر 501ء میں وہ قتل ہوا اور قباذ نے دوبارہ تخت پر قبضہ کر لیا۔ 73 طہماسپ کے قتل اور اقتدار پر دوبارہ قبضہ کرنے کے بعد قباذ نے دوبارہ بلوچوں پر

فوجی کشی کی مگر اپنی زندگی میں وہ اس بغاوت کو فرو نہ کر سکا اس وجہ سے 531ء میں اس کے مصائب مشیروں نے مشورہ دیا کہ آپ کے والد بزرگوار ان کا قلع قمع نہ کر سکا لہٰذا انھیں ان کے حال پہ چھوڑ کر آپ دیگر امور سلطنت کی طرف توجہ دیں۔ مگر نوشیروان نے ان کی باتوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی اور بلوچوں پر فوجی کشی کی۔ بلوچ جو کہ فوجی اور منظم جنگوں کے بھی خوب تربیت یافتہ تھے نے ساسانی افواج کو ابتدائی حملوں میں شکست سے دوچار کیا۔ ایرانی لشکر کی ان پے در پے شکستوں سے نوشیروان کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ کہیں بلوچ دیگر باغی اور جنگجو اقوام کے ساتھ مل کر اس کی سلطنت کے خاتمہ کا سبب نہ بنیں اس کے بڑے بڑے سورما، پہلوان اور سالاران جنگوں کی نذر ہو چکے تھے۔ لہٰذا کافی سوچ و بچار کے بعد ساسانی بادشاہ نے ایک مربوط پروگرام اور منصوبہ تشکیل دیا۔ اس منصوبہ کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی خاطر ایک عظیم الشان لشکر ترتیب دیا گیا۔ جس کی تعداد لاکھوں میں تھی اور وہ ہر طرح کے کیل کانٹے سے لیس تھی براہ راست یہ لشکر ایلان و گیلان کے صوبوں پر قابض بلوچ لشکر پر حملہ کرنے کی بجائے ایک لمبا کاوا کاٹتے ہوئے آذر بائیجان کی جانب سے کوہ البرز پر حملہ آور ہوا اور بلوچ آبادیوں کو ملیامٹ کر کے رکھ دیا۔ نوشیروان کو چونکہ یہ خدشہ بھی لاحق تھا کہ بلوچ جنگجو کہیں بھی اسکا راستہ روک کر پچھلی جنگوں کی طرح ایک بار پھر اس پر جوابی حملہ کر کے اسے تباہ کر سکتے ہیں لہٰذا بلوچوں کی ان افواج کے مقابلے میں جو البرز سے متصل صوبوں میں برسرپیکار تھے الگ فوجی دستے بھیج کر انھیں وہیں پر مصروف رکھا اور خود اپنے عظیم و جرار لشکر کے ساتھ بلوچوں کے قلعوں پر بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہوا۔ وہ بلوچ لشکر جو ایلان و گیلان کے صوبوں میں ایرانی فوج سے نبرد آزما تھی جب انھیں نوشیروان کے البرز پر حملے کی اطلاع ملی تو ان کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔

کوہ البرز کی وادیوں میں اور قلعوں میں لوگ اپنی روزمرہ کی معمولات میں مصروف تھے۔ چرواہے بھیڑ بکریوں کے ریوڑوں کے ساتھ پہاڑوں کی طرف نکل گئے تھے۔ خواتین گھروں میں خانہ داری میں مصروف تھیں کوئی آٹا گوندھ رہی تھی کوئی برتن مانجھ رہی تھی کوئی صفائی خانہ میں مصروف تھی۔ بچے گلیوں اور محلوں میں کھیل رہے تھے باقی لوگ بھی کام کاج میں اور معمولات زندگی میں مصروف تھے اور ایرانیوں سے مصروف پیکار اپنے لشکریوں کے بارے میں گفت وشنید کر رہے تھے حتیٰ کہ انتہائی پرسکون ماحول تھا اور اپنے لشکروں کی کامیابی کے تذکروں پر خوش ہو رہے تھے۔ کسی

کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ دشمن کالشکران کے سروں پر آ پہنچا ہے۔اچانک البرز کی پہاڑی وادیاں گھوڑوں کے ٹاپوں کی دھمک سے لرز نے لگیں اور پھراچانک نوشیروانی لشکر نے اس پر سکون ماحول کو ہنگامہ جنگ اور خون ریزی میں تبدیل کر دیا۔نوشیروانی حملے سے بے خبر بلوچ لشکر کا وہ حصہ جوحفاظت اور کمک کے طور پر البرز کے قلعوں میں موجود تھاان حملوں کی نذر ہو گیانوشیروان کا یہ حملہ پچھلے پچاس سالہ جنگوں کے دوران سب سے منظم حملہ تھا۔اس کے لشکر کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی اور اس نے اس تمام لشکر کو پہلے کوہ البرز میں پھیلا دیا تھا اور پھر یک بارگی پوری بلوچ آبادی پر حملہ آور ہوا تھا۔بے خبر بلوچوں کوسنبھلنے اور پلٹ کر اپنا دفاع کرنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ اس اچانک بلائے ناگہانی نے ان کے اوسان خطا کر دئے اور پھر جسکا جدھر منہ اٹھا بے سروسامانی کے عالم میں فرار ہوا۔

مندرجہ بالا الفاظ اس اہم ترین واقعہ کے بارے میں ہیں جو ساسانی دور میں پیش آیا تھا اور جس نے پہلے پہل ساسانی حکومت کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی تھیں مگر بعدازاں نوشیروان نے اپنے تدبر اور مکاری سے اس ساری منفی صورتحال کو اپنے حق میں کر دیا تھا۔اس تمام واقعات کو فردوسی نے منظوم انداز میں بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔مندرجہ بالا تمام صورتحال کو سمجھنے کیلئے ان اشعار کو ذیل میں دیا جا رہا ہے۔

ہمی رفت و آگاہ آمد بہ پادشاہ　　کہ گشت از بلوچی جہانے تباہ
زبس غارت وکشتن و تاختن　　زمین را بہ آب اندر انداختن
زگیلان تباہی فزوں است ازیں　　زنفریں پراگندہ گشت آفریں
دل شاہ نوشیرواں شد غمی　　بر آمیخت اندوہ با خرمی
شد از بیم شمشیر ماچوں پرند　　بہ ایرانیاں گفت الا نان و ہند
ہمی شیر جو ہم پیچان زمیش　　پسندہ نباشیم با شہر خویش
بہ پالیزنیست بے رنج و خار　　بدو گفت گویندہ کا یہ شہر یار
زبہرہ پراگندن گنج بود　　ہماں مرز تابود بارنج و بود
بگوشید با کارِ دانان پیر　　زکارِ بلوچ ارجمند اردشیر
نہ از بند ورنج و نہ پیکار و جنگ　　نبود سود مندی بافسوں و رنگ

بپوشید بر خیشتن اردشیر　　اگر چند بد ایں سخن ناگزیر
بہ سوی بلوچ اندر آمد بہ راہ　　زگفتار دہقان بر آشفت شاہ
بگردید گرداندرش باگروہ　　چوں آمد بہ نزدیک آں بزرکوہ
کہ بستند برباد و برمور اراہ　　بدان گونہ گرد اندر آمد سپاہ
سپاہ بدو برسان مورو ملخ　　ہمہ دامن کوہ تاروی مشخ
خروش آمد از کوہ واز غار و دشت　　منادی گرے گرد لشکر بگشت
چہ از تیغ داران مردان گرد　　کہ ہر گز بیابند بلوچ خورد
نباید کہ باید رہائی یکے　　دگر انجمن باشد باندکے
سوار و پیادہ بہ بستند راہ　　چوں آگاہ شد لشکر از خشم شاہ
زایشان فراوں اندک نماند　　زن و مرد وجنگی کودک نماند
سراسر بہ شمشیر بگذاشتند　　ستم کردن کوچ برداشتند
بشد ایمن از رنج ایشاں جہاں　　بلوچی نماند آشکار و نہاں
چناں بد کہ بر کوہ ایشاں گلہ　　بدی بے نگہبان و گردی یلہ
شبانے نبودی بر گو سفند　　بہ ہامون و بر تیغ کوہ بلند
ہمہ رنج ہا خوار بگزاشتند　　درکوہ راخانہ پنداشتند
از آنجاں کہ سوی گیلاں کشید　　چوں رنج آمد از گیل ویلم پدید
زور پہ سپاہ بود تیغ کوہ　　ہوا پردرفش و زمین بر گروہ
پراگندہ بر گرد گیلان سپاہ　　کہ شد روشنائی ز خورشید و ماہ
زبس کشتن و غارت و سوختن　　خروش آمد از نالہ ومرد وزن 74

یہ اشعار یہ ثابت کرتے ہیں کہ بلوچوں کی ایک کثیر آبادی کوہ البرز اور اس کے گردونواح میں آباد تھی۔اب ایسی منظم قوت کو جو قلعوں، چھوٹے شہروں اور دیہاتوں میں رہتی تھی، خانہ بدوش لکھنا اور انھیں لٹیرا لکھنا یقیناً ایک تاریخی ناانصافی کے مترادف ہے۔ایران کی تمام شہنشاہتیں بغیر کسی مبالغہ کے بلوچوں کے ہی دم سے قائم تھیں۔ان کی تمام تر فتوحات کا سہرا بھی اس بہادر اور جنگجو قوم کی مرہون منت تھیں۔اگر ان کی کمک میدی، ہخامنشی، آشکانی اور ساسانی افواج کے ساتھ نہ ہوتی

تو شاید یہ خانہ بدوش آریائی اقوام کبھی بھی ایران پر اپنی بادشاہت قائم نہ کر پاتے بلکہ اپنی سابقہ خانہ بدوشانہ زندگی پر قائم رہتے ہوئے وادیوں اور پہاڑوں اور دیس دیس بھٹکنے پر مجبور ہوتے۔ اگر یہ کہا جائے کہ بلوچوں نے ہی ان خانہ بدوش آریائی اقوام کو شہریت اور مدنیت سے روشناس کرایا اور انھیں حکومت کرنے اور لڑنے کے گر سکھائے تو بیجا نہ ہوگا۔

شاہنامہ فردوسی میں صرف یہی مندرجہ بالا اشعار ہی بلوچوں کے بارے میں نہیں ہیں بلکہ پورے پانچ ابواب بلوچوں کے بارے میں موجود ہیں۔ گو کہ موضوع بہت طویل ہوگا لیکن حقائق کی طرف مزید پیش قدمی کیلئے ضروری ہے کہ ہم ان تمام ابواب کا مطالعہ کریں تا کہ نہ صرف بلوچوں کی نسلی اور قومی اصلیت پر سے پردہ کشائی کی جاسکے بلکہ ان کے اصل جغرافیہ کے بارے میں بھی آگاہی ہو سکے کیونکہ مؤرخین انھیں اکثر صرف ایران میں آباد بتلاتے ہیں جبکہ فردوسی انھیں مزید کئی علاقوں میں سکونت پذیر ظاہر کرتا ہے جو کہ ایران کے مرکز سے سینکڑوں بلکہ ہزاروں میل دور واقع تھے۔

فردوسی لکھتا ہے کہ:-

گزیں کرد از آن نامداران سوار   دلیرانِ جنگی دہ و دو ہزار
ہمی پہلی پارس کوچ وبلوچ   زگیلان جنگی و دشت سروچ
پس از گستم اشکش تیز ہوش   کہ بارائے دل بود بامغزز و ہوش
یکی گرز دار از نژاد ہماہی   برائے جنبش بودی بپاہی
سپاہی زگردان کوچ و بلوچ   سگالیدہ جنگند مانند قوچ
کہ کس در جہاں پشت ایشان ندید   برہنہ یک انگشت نامدپدید
سپہدار شان بود رزم آزماہی   کرد بود کاہ دنکوئی بجاہی
درفش بیارودہ پیکر پلنگ   ہمی از درفش بیارید جنگ
بسے کرد آفرین بر شہر یار   برآن شادمان گردش روزگار
نگاہ کرد کیخسرو از پشت پیل   ردہ آن سپاہ راز دہ و دو میل
پسند آمدش سخت کرد آفرین   برآن بخت بیدار فرخ زمین
دگر گیہور اداد شہر ختن   خطاو چگل اشکش تیغ زن

چوں شماخ سوری شہر سوریاں   کجا رزم رابستہ بودی میان
سپر ہائی گیلی بہ پیش اندرون   ہمی از جگر شان بجوشید خون 75

جس زمانے میں ایران میں میدیوں کی حکومت قائم تھی موجودہ بلوچستان، سیستان اور خراسان سمیت وسط ایشیاء کے ایک وسیع رقبے پر ایک اور ترکمان خاندان تورانی کی سلطنت قائم تھی۔ یہ نسلاً ترکمن تھے اور میدیوں کے رشتہ دار کہلاتے تھے۔ جب ہخامنشیوں نے میدیوں کی حکومت کا خاتمہ کر کے ایران کے تاج وتخت ترکمان پر قبضہ جمالیا تو تورانیوں نے ان کی اس حیثیت کو تسلیم کرنے سے انکار کیا جسکی وجہ سے ایران اور توران کے درمیان طویل جنگوں کا آغاز ہوا۔ اس طویل جنگ کے اولین حصے میں ایرانیوں نے وسط ایشیاء اور سیستان کا حصہ تورانیوں سے چھین لیا مگر یہ لڑائی پھر بھی جاری رہی۔ آخر کار امیر اشکش (بلوچ) کی ہوش مندی، بہادری اور تدبر کیوجہ سے ہخامنشیوں کو فتح حاصل ہوئی اور افراسیاب شاہ توران بالآخران جنگوں میں مارا گیا۔ اس طرح توران کا ایک وسیع علاقہ ہخامنشیوں کے زیر نگیں آ گیا۔ تورانی سلطنت کا وہ حصہ جو بلوچستان پر مشتمل تھا وہ ہنوز مختلف تورانی سرداروں کے زیر نگین تھا ان میں مضبوط اور طاقتور سردار کک تھا جس کا لقب کوہزاد تھا اور وہ نسلاً افغان تھا مگر اسکے سپاہی بلوچ تھے۔ ہخامنشیوں نے کک کو ھزاد اور اس کے بھائی بہزاد کو زیر کرنے کیلئے جس سپہ سالار کا انتخاب کیا وہ بھی سیستان کا ناہروئی تھا جس کا نام رستم بن زال تھا۔ تاریخ کے صفحات ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ رستم بن اور سیستان کا حاکم تھا۔76 شاہنامہ فردوسی میں اس جنگ کی بھی تفصیلات موجود ہیں۔ یہ بھی ایک لمبی اور منظوم داستان ہے مگر ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ بلوچ اس زمانے میں کہاں کہاں پر آباد تھے۔ یہ اشعار پہلے بھی تحریر ہو چکے ہیں یہاں صرف اس لئے ان کو دوبارہ دھرایا جا رہا ہے تا کہ بلوچوں کے مساکن معلوم کیئے جاسکیں۔ فردوسی لکھتا ہے کہ۔

کہ نزدیک زابل بہ سی روزہ راہ   یکے کوہ بود سر کشیدہ بہ ماہ
بہ یک سوئے او دشت خرگاہ بود   دگر دشت زابندرد راہ بود
نشتند درآن دشت بسیار کوچ   زاوگان ولاچین وکرد بلوچ 77

مندرجہ بالا اشعار میں واضع طور پر بلوچوں سمیت دیگر اقوام کی بولان کی وادیوں تک سکونت پذیری کا حال بیان ہوا ہے۔ ان اشعار میں بلوچوں کو خطے میں مستقل آباد کار بتایا گیا ہے

نہ کہ خانہ بدوش اور ساتھ ہی وہ توران کے فوجی لشکر میں بالکل وہی مقام رکھتے تھے جو مقام وہ ایران کی فوج میں رکھتے تھے اور آج بھی بلوچ قبائل ان ہی مذکورہ بالا علاقوں میں آباد ہیں لہٰذا شاہنامہ کے یہ اشعار ہی ثابت کرتے ہیں کہ بلوچ قبائل زمانہ ماقبل تاریخ سے ہی شہریت اور مدنیت کے قائل تھے اور وہ آریاؤں کی طرح خانہ بدوش اور صحرانورد نہیں تھے۔ ایرانی اور تورانی جنگوں کے اگلے ادوار میں بھی ایرانی سلطنت کو فتح نصیب ہوئی اور ہخامنشیوں نے پورے بلوچستان پر اپنا تسلط جمالیا۔ کک کو ہزاد اور اسکا بھائی بہزاد اس جنگ میں گرفتار ہوگئے اور رستم نے وسطی بلوچستان (سراوان، جھالاوان) پر ایرانی سطوت کے پرچم لہرادیئے۔

سیستان زمانہ قدیم سے ناہروئی بلوچوں کے زیرنگین تھا اور یہ خطہ بھی باقی بلوچ خطوں کے ساتھ منسلک تھا۔ مگر چونکہ بلوچ زمانہ قدیم سے بڑی سلطنتوں کے زیراثر رہنے کے باوجود اپنے علاقوں کے اندر قبائلی تحفظات کے تحت زندگی بسر کرتے تھے لہٰذا سیستان ناہروئی بلوچوں کے زیرنگیں تھا جو میدیوں سے بھی قبل یہاں کے حاکم رہتے چلے آرہے تھے اس طرح سیستان میں بھی ان کی اقامت ثابت ہوتی ہے۔

مندرجہ بالا اشعار سے ہی بلوچوں کی مستقل بود و باش اور جاہ سکونت کا پتہ چل جاتا ہے اور یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بلوچ خانہ بدوش یا لٹیرے نہیں تھے فردوسی کے علاوہ بھی عرب سیاح اور روزنامچہ نویسوں نے ایرانی اور پاکستانی خطے میں بلوچوں کی مستقل سکونت اور بود و باش کا تفصیلاً ذکر کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ وہ قلعوں میں رہتے تھے۔ 78

اس تفصیلی بحث سے نہ صرف میر گل خان نصیر کے باتوں کی وضاحت ہوگئی بلکہ بلوچوں کی قدامت بھی ثابت ہوتی ہے اور یہ بھی کہ نہ صرف یہ کہ عرب نہیں بلکہ حضرت امیر حمزہؓ کی اولاد بھی نہیں ہیں۔ مختصر یہ کہ ایک عظیم فوجی قوت کو کہ جنگی صلاحیتوں کی وجہ سے ایران میں مختلف آریائی خاندانوں نے مستحکم حکومتیں قائم کیں انہی کے بل بوتے پر اپنی سرحدات کو وسعت دی اور ان ہی کی وجہ سے نئے ممالک اور نئی زمینوں کے مالک بنے جنکے دبدبے اور صلاحیتوں کا ایرانی قوم خود بھی معترف ہے انھیں خانہ بدوش لٹیرا اور راہزن لکھنا یقیناً نامناسب ہے۔

محمود غزنوی کے دور میں بھی بلوچ انہی مذکورہ خطوں میں سکونت رکھتے تھے گو کہ دشت لوط میں بلوچوں نے محمود غزنوی کے خلاف بغاوت کی تھی۔ 79 اور خضدار میں بھی انہوں نے بغاوت

کا آغاز کیا تھا۔ 80 مگر مؤرخین یہ بھی کہتے ہیں کہ جب محمود ہندوستان پر مسلسل حملے کرتا رہا تو بلوچوں کی ایک کثیر تعداد اسکے فوج میں بھی شامل تھی۔ 81 جو ان کی قدامت اور جاہ سکونت سمیت قدیم مدنیت کو بھی ثابت کرتی ہے۔

محمود غزنوی کے علاوہ آل بویہ کے دور میں بھی جب بلوچ خطے پر تسلط جمانے کی کوشش کی گئی تو بلوچ قبائل اس جبر اور زیادتی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اس تمام تر بغاوت (ان جنگوں کیلئے لفظ بغاوت بذات خود غلط ہے یہ دراصل قومی آزادی اور بیرونی قبضے سے نجات کی جنگیں تھیں چونکہ بلوچ بے یار و مددگار ہو کر لڑ رہے تھے اور لاکھ استقامت کے باوجود انھیں شکست ہو رہی تھی لہٰذا بالادست قوتوں نے ان کی ان آزادی اور نجات کی جنگوں کو بغاوت کا نام دیا حالانکہ وہ اپنی ہی قدیم سرزمین پر آباد تھے اور بیرونی حملہ آوروں کے خلاف برسرپیکار تھے) کا بیان تفصیل کے ساتھ مشہور مورخ بابائے مسلم تاریخ نویسی اور بابائے عمرانیات عبدالرحمٰن ابن خلدون کے مشہور کتاب تاریخ ابن الخلدون میں موجود ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"جس وقت عضدالدولہ نے کرمان پر قبضہ کرلیا تو پہاڑی جرگہ اور بادیہ نشینوں نے جمع ہو کر عضدالدولہ کی مخالفت اور بغاوت پر کمریں باندھ لیں ان میں ابوسعید اور ان کے لڑکے تھے۔ عضدالدولہ نے کورتکین بن خشان حاکم کرمان کی مدد پر عابد بن علی کو مامور کیا عابد بن علی فوجیں لیکر جیرفت کی طرف بڑھا اور ان باغیوں سے معرکہ آراء ہوا اور انھیں شکست دیکر نہایت بے رحمی سے پامال کیا۔ نامی نامی سرداروں کو گرفتار کر کے مار ڈالا انہی مقتولوں میں ابوسعید کا لڑکا بھی تھا۔ اس کے بعد عابد بن علی نے ان کا تعاقب کیا اور چند بار ان پر حملہ آور ہوا اور خوب خوب پامال کیا لوٹ مار کرتا ہو ہرمز تک پہنچا اور اس پر بھی قبضہ کرلیا تبریز اور مکران پر بھی قابض ہوگیا ان میں سے ایک ہزار کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا مجبور ہو کر سب نے اطاعت قبول کر لی اور صدور اسلام قائم رکھنے پر راضی ہوگئے۔ اس کے بعد عابد بن علی نے ایک دوسرے گروہ کی سرکوبی کی غرض سے لشکر آرائی کی جو حروسکیہ اور جاسکیہ (بلوچ قبائل کے شہریتی نام) کے نام سے مشہور تھے۔ یہ خشکی اور دریا میں راہزنی کرتے تھے دن دہاڑے مسافروں کے قافلے لوٹ لیتے تھے۔ سلیمان بن ابوعلی بن الیاس ان کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ جب عابد بن علی نے ان پر حملہ کیا اور بزور تیغ پامال کرنے لگا تو

انہوں نے بھی علم حکومت کی اطاعت قبول کر لی۔ جس سے ایک مدت تک ان ممالک میں امن و امن قائم رہا کچھ عرصہ بعد بلوائی پھر جمع ہو گئے اور رہزنی شروع کر دی۔ ذیقعدہ 360ھ میں عضد الدولہ نے ان لوگوں کی گوشمالی کی غرض سے کرمان کی طرف کوچ کیا عابد بن علی کو ان پر حملہ کرنے کی غرض سے آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ عابد بن علی نے نہایت تیزی سے جنگ کا آغاز کیا بلوائی ایک تنگ وتاریک درہ میں اس خیال سے کہ یہ انھیں حملہ آوروں کے حملے سے بچالے گا داخل ہو گئے لیکن عضد الدولہ کی فوج نے انھیں وہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ ماہ ربیع الاول 361ھ میں پوری طاقت سے حملہ کیا باغی ایک شب وروز تک استقلال سے مقابلہ کرتے رہے، بالآخر شام ہوتے ہوتے شکست کھا کر بھاگ نکلے بڑے بڑے سورما مارے گئے لڑکے عورتیں لونڈی اور غلام بنا لئے گئے صرف چند افراد کی جانیں بچیں امن کے خواستگار ہوئے امن دیا گیا اوران کو پہاڑوں سے جلا وطن کر کے دوسرے مقام پر بھیج دیا گیا۔ عضد الدولہ نے ان مقامات میں کاشتکاروں کو آباد کیا جنہوں نے اپنے زور بازو سے زمین کو آباد کیا۔ عابد بن علی برابر ان بلوائیوں پر حملے کرتا چلا آیا تھا یہاں تک کہ ان کی جمعیت ختم ہو گئی اوران کا نام ونشان صفحہ ہستی سے مٹ گیا اور فتنہ وفساد کا خاتمہ ہو گیا"۔82

اس اہم ترین تاریخی واقعہ میں بھی موجودہ ایرانی، افغانی اور پاکستانی بلوچستان کے تمام علاقوں میں بلوچوں کی سکونت کے واضح ثبوت موجود ہیں جنہوں نے ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر دراندازوں، حملہ آوروں اور قابضوں کے خلاف اپنی جنگ آزادی لڑی۔ حملہ آور طاقتور اور ہر طرح سے مسلح غیر ملکی افواج کے سامنے ایک بار پھر صحرائی، پہاڑی اور نہتے بلوچ ڈٹ گئے اور جیرفت سے لیکر دھڑام تک ایک طویل اور تھکا دینے والا محاذ اپنے دشمنوں پر کھولا اور قربانیوں کی ایک لازوال تاریخ رقم کی۔ ان کے بے شمار میر و معتبر اور قبائلی ان خونی جنگوں کی نذر ہو گئے اور جب دشمن کا غلبہ مزید بڑھنے لگا تو یہ جفاکش پہاڑی باشندے اپنے پہاڑی کمین گاہوں میں چلے گئے جہاں آل بویہ کے کرائے کے سپاہیوں کا پہنچنا ناممکن تھا۔

ابن خلدون کے ان الفاظ کے ساتھ اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ بلوچ قبائل کا خاتمہ ہوا۔ یہی الفاظ فردوسی نے بھی ادا کئے تھے مگر آج تاریخ میں بلوچ ایک زندہ وجود رکھتی ہے اور بالکل اسی سرزمین پر آباد ہیں جہاں وہ ہخامنشی، میدی، ساسانی، آشکانی، آل بویہ اور غزنوی دور میں آباد تھے

مگر مذکورہ بالا قوموں کا بذات خود نام ونشان تک مٹ گیا بلکہ ان میں سے بہت سارے دھڑے بلوچوں میں ہی آ کر مدغم ہو گئے جنہیں اب ڈھونڈ نکالنا جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔

مندرجہ بالا طویل بحث سے میر گل خان نصیر کے ان الفاظ کی یقیناً وضاحت ہو گئی ہو گی کہ جس میں انہوں نے انتہائی سادگی کے ساتھ بلوچوں کیلئے لٹیرا، خانہ بدوش، ساسانیوں کے ہاتھوں بے کسانہ قتل عام اور کوہ البرز سے بے دخلی کا ذکر کیا ہے۔ مختصراً یہ کہ بلوچ سپاہی، لڑاکا، جنگجو اور آزاد منش تھے ایک طویل عرصہ تک ایرانی حکومتوں کو بنیاد فراہم کرتے رہے اور جب اختلافات کی چنگاری دونوں کے درمیان بھڑک اٹھی تو انہوں نے طویل عرصے تک ساسانیوں کا مقابلہ کیا مگر ساسانیوں نے انھیں دھوکے سے شکست دی اوران کا کثیر تعداد میں قتل عام کیا۔ انھوں نے اپنے مسکن کا بھرپور دفاع کیا گو کہ اس میں وہ تقریباً ناکام رہے لیکن اس ناکامی کو ان کی بزدلی نہیں کہا جا سکتا۔ غزنوی اور آل بویہ کے ادوار میں بھی انھیں اس طرح دھوکہ دہی سے مارا گیا وگرنہ میدان جنگ میں انھیں شکست دینا ایرانیوں، غزنویوں یا آل بویہ کے بس کی بات نہیں تھی۔ زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں یہی تاریخی ستم تو ان کے ساتھ پاکستان کے آمر حکمران جنرل ایوب خان کے دور میں بھی دھرایا گیا جب نوروز خان اوران کے ساتھیوں کو قرآن کا واسطہ دیکر پہاڑوں سے اتارا گیا اور بعدازاں وعدہ خلافی کرتے ہوئے انھیں گرفتار کر کے جیل میں ڈالا گیا اوران کے بقیہ ساتھیوں کو جن میں اسکا بیٹا اور بھانجا بھی شامل تھے سکھر اور حیدرآباد کی جیلوں میں پھانسی دی گئی۔83

خانہ بدوش کبھی بھی زمین کے ٹکڑے یا کسی پہاڑی پتھر کیلئے نہیں لڑتا اسے مٹی کے ذروں یا پہاڑی لعل و جواہر کی قدر کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا اسکی لڑائی تو عموماً کسی چراگاہ یا پہاڑی چشمے کیلئے ہوتی ہے اور کوئی خانہ بدوش کسی عالمی طاقت سے کبھی ٹکر نہیں لیتا اسکی لڑائی تو عموماً اپنے جیسے کسی دوسرے قبیلے سے ہوتی ہے جو کسی چراگاہ یا پانی کے چشمے پر قابض ہوا ہو۔ وہ تو ایک جگہ ٹک کے بیٹھتا نہیں اسے زمین کی قدر و قیمت کا کیا پتہ ہو گا اور اسکا کوئی وطن نہیں ہوتا اور جسکا وطن نہیں ہوتا تو بھلا وہ پرائی زمین کیلئے کیوں لڑے اور اسے وطن کی قدر و قیمت کا کیا اندازہ۔ بلوچوں کی تاریخ تو یہ ہے کہ آرین حملوں 1500 ق م سے لیکر موجودہ دور تک اپنے وطن کی دفاع کی خاطر عالمی طاقتوں سے نبرد آزما ہیں۔ بھلا ایک بے وطن چرواہا یہ سب کچھ کیسے کر سکتا ہے۔

اسی طرح میر گل خان نصیر کوہ البرز میں شدید قتل عام کے نتیجے میں ان کے بجانب، نغاڑ، قلات، سوراب، چھپر وغیرہ میر قمبر کی سرکردگی میں فرار کی بھی ایک لمبی داستان بیان کرتا ہے۔ در اصل اس واقعے میں کوئی حقیقت نہیں ہے کہ میر قمبر البرز سے آیا تھا اور قلات میں برزکوہی اور بعد ازاں براہوئی کہلائے۔ گو کہ البرز کے خونی حادثے کے بعد وقتی طور پر بلوچوں کی ایک کثیر جمیعت فرار ہو کر ہمسایہ ممالک کی طرف چلے گئے تھے مگر بقول فردوسی کے کہ کچھ عرصہ بعد جب حالات بہتر ہوئے اور باقی ماندہ بلوچوں نے نوشیروان کی اطاعت قبول کی اور دوبارہ ایرانی افواج میں شامل ہو گئے تو فرار ہونے والے دوبارہ اپنے اپنے علاقوں میں آباد ہو گئے اور بعض کو نوشیروان نے پہاڑوں سے اتار کر ایلان اور گیلان کے صوبوں میں آباد کیا بالکل اسی طرح 361 ھجری میں آل بویہ نے گرفتار شدہ پہاڑی بلوچوں کو شہروں میں مختلف جگہوں پر بسایا تا کہ ان کی باغیانہ (آزادی پسند) روش کا خاتمہ ہو سکے۔ آج ایران، افغانستان، ترکی، وسط ایشیاء کے کتنے شہر ہونگے جہاں قدیم زمانے کے بلوچ آباد ہیں مگر تحقیق کے باوجود ان کو شناخت کرنا اور ان کے ماضی کو کھوجنا مشکل ترین کام ہے۔

میر قمبر کی شخصیت بالکل اسی طرح ہے جیسا کہ میر جلال خان کی شخصیت ہے میر جلال خان اور میر قمبر کا عہد بھی تقریباً وہی ہے جو میر جلال خان کا۔ تیرھویں اور چودھوں صدی عیسوی میں ہی دونوں شخصیات کا ظہور ہوتا ہے دونوں عظیم شخصیات اپنے اپنے خطوں (مکران اور قلات) میں اپنے قبائل کیلئے گراں قدر خدمات سرانجام دیتے ہیں جسکی وجہ سے ان کا مقام و مرتبہ بلوچ قبائل میں ایک ولی اللہ جیسا بن گیا تھا جیسا کہ مستقبل میں چاکر خان رند اور نصیر خان احمد زئی بلوچوں کے لئے ولی اللہ اور بزرگ کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔

میر قمبر اور اس کے قبائل زمانہ قدیم سے قلات اور آس پاس کے پہاڑی خطے میں آباد تھے جس کا ذکر پچھلے اوراق میں اربوئی کے نام سے ہوا۔ البتہ سیاسی بھاگ دوڑ دیگر بالادست اقوام کے ہاتھوں میں تھی۔ قبل از اسلام خطے پر کبھی ایرانیوں کی بالادستی قائم ہوتی تو کبھی ہندوستان کو سبقت حاصل ہوتی یہ کشمکش صدیوں تک جاری رہا۔ اسلام کی آمد کے بعد پہلے پہل عربوں نے علاقہ پر قبضہ کر لیا حتیٰ کہ قلات، خضدار، مکران و بیلہ ان کے قبضے میں چلے گئے۔ 400 سالوں تک منتشر اور دور دراز پہاڑی وادیوں میں آباد بلوچ عربوں کے سامنے مزاحمت پیش کرتے رہے

عرب تو چلے گئے مگر بلوچ اب بھی اپنے پہاڑی مورچوں میں چوکس ہیں۔ شاہنامہ فردوسی اور دیگر عرب مخطوطات، تحریریں، تواریخ اور روزنامچے خطہ بلوچستان میں زمانہ ماقبل تاریخ سے بلوچ آبادی کی تصدیق کرتے ہیں۔

یہ تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ بلوچ مؤرخین خود ہی اپنے اسلاف کو باہر سے آنے والے مہاجر لکھتے ہیں اور ان کی شخصیت کو کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ وہ شخصیت حقیقت سے زیادہ افسانوی بن جاتا ہے۔ میر قمبر اور اس کے قبائل کو برزکوہ سے قلات اور جھالاوان کے پہاڑوں میں ایک مہاجر کی حیثیت سے متعارف کروانا یقیناً مضحکہ خیز ہے اور اس نظریے کی کوئی تاریخی حیثیت نہیں بنتی۔ اس ہجرت کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہے البتہ اگر یہ کہا جائے کہ مکران، توران، سراوان اور قلات و مستونگ میں بلوچ قبائل زمانہ قبل از تاریخ سے آباد تھے تو یہ بات حقیقت کے زیادہ قریب ہوگی کیونکہ اگر مکران میں رند بلوچوں کو اور جھالاوان (توران) میں قمبرانی بلوچوں کو باہر سے آنے والا طائفہ یا مہاجر بیان کیا جائے تو وہ بلوچ کون تھے جو ان سے پہلے ان خطوں میں آباد تھے اور جنکا ذکر شاہنامہ فردوسی میں کک کوہزاد اور رستم ناہروئی کے درمیان چپقلش اور جنگ کے موقع پر کیا گیا ہے وہ بلوچ قبائل تو نوشیروانی حملے سے بھی ایک ہزار سال قبل سے زیادہ عرصے سے اس خطے میں مستقلاً آباد تھے۔

اسی طرح ہیروڈوٹس لاتعداد بلوچ قبائل کے نام رقم کرتا ہے مثلاً مکرونی یا میکرانی، پیرکانی یا پریکانی (پرکانی) ساگدی یا ساجدی، یوت یا ہوت، ہیرکانی (البرز اور ہیرکانیہ کے قدیم باشندے) ماشئی یا ماشئی، مانسیانی یا ماسنی، دان یا دایانی، مردیان یا مردیانی، جرمانی یا کرمانی، ساپیری یا سرپرائے (یعنی سرپرہ)، مید، تیارینی یا تورانی، موسی نوشی وغیرہ۔ 84

درج بالا قبائل کے علاوہ کئی دیگر قبائل کا تذکرہ وہ اپنی کتاب میں تفصیل یا اختصار کے ساتھ کرتا ہے البتہ انھیں غیر فارسی (غیر آرین) اقوام قرار دینے کے ساتھ ساتھ فارسیوں کا اتحادی اور ایرانی افواج کے اہم دستے تحریر کرتا ہے۔

یہی اقوام تھے کہ جن کے ساتھ مل کر زرکسیز شاہ ایران نے یونان پر 480 ق م کے لگ بھگ حملہ کیا تھا اور تھرماپائلے کی مشہور جنگ وقوع پذیر ہوئی تھی اور یہی وہ قبائل ہیں کہ جنکا ذکر توراکینہ قاضی نے بھی کیا ہے اور وہ بھی جابجا نہ صرف ان کا تذکرہ کرتی ہے بلکہ انھیں اسوارن

یعنی ایرانی افواج کے لافانی دستے قرار دیتی ہے۔اور یہی وہ قبائل تھے کہ جنہیں فردوسی نے کوچ و بلوچ قرار دیا ہے اور ہیروڈوٹس کے بیانات کی تصدیق کی ہے۔ بعدازاں عربوں نے بھی اسی لفظ یعنی کوچ و بلوچ کو انہی قبائل کے متعلق تحریر کیا۔

دراصل ہیروڈوٹس سمیت تمام مؤرخین کہ جنہوں نے اپنی قدیم تحریروں میں اگر کہیں بلوچی خطے کا تذکرہ کیا ہے تو انہوں نے بجائے لفظ بلوچ یا کوچ و بلوچ کہ، جس طرح فارسی اور عرب مؤرخین تحریر کرتے ہیں، انہوں نے اس کے برعکس قبائل کے نام تحریر کئے یا پھر ان کو ان کے قائم کردہ کنفیڈریسیوں سے منسوب کیا۔ جیسا کہ ہیروڈوٹس ہیرکانیوں کا تذکرہ کرتا ہے کہ جو بحیرہ ہیرکانیہ یعنی (Caspian Sea) کے تمام قبائل کیلئے مستعمل تھا۔ یا کرمانی، کرمان کے تمام باشندوں کو مجموعی طور پر کہا جاتا تھا۔ اسی طرح مکرانی یا میکرونی کا لفظ بھی مکران کے تمام قبائل کے لئے مستعمل ہوتا ہوگا۔ مگر یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مکران کے باشندے مکرانی کہلاتے تھے تو پھر یقیناً علاقے کا نام مکران ہوگا مگر ہیروڈوٹس کے بعد کے مؤرخین مثلاً آرین، سٹریبو وغیرہ نے اسے گیڈروشیا اور اتھیتا فیگوئی تحریر کیا ہے اور تاریخ کے قاری یہ جانتے ہیں کہ لفظ گیڈروشیا مکران کے لئے یونانی مؤرخین استعمال کرتے تھے۔ مگر اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ قبائل کون تھے کہ جنہیں ہیروڈوٹس میکرونی یا مکرونی اور موسی نوشی تحریر کرتا ہے اور ان کا جغرافیہ اور محل وقوع موجودہ خطہ مکران بیان کرتا ہے؟ اور یہ کہ، انھیں ہیروڈوٹس نے میکرونی اور موسی نوشی کیوں کہا ہے؟ اس کا صرف ایک ہی جواب ہوسکتا ہے کہ یقیناً سکندر کے دور میں اس خطے کو انہوں نے اپنے اختراع کردہ نام دیئے تھے۔ مثلاً جب وہ جھلاوان کے جنوبی علاقے سے گزرے تو ان کا واسطہ جن قبائل سے پڑا انھیں اربوئی کا نام دیا اور ان کے علاقے کو بھی اسی نام سے پکارا جبکہ ان کے آبی وسائل یعنی دریا کو اربینس قرار دیا۔85 جواب دریائے پورالی تسلیم کیا گیا ہے۔86 جب وہ لسبیلہ پہنچے تو اس پورے خطے اور اس کے باشندوں کو اپنی زبان میں اوریتائی کا نام دیا۔87 جبکہ بیلہ شہر کہ جو اس وقت موجود تھا کا نام مؤرخین رمبکیہ تحریر کرتے ہیں۔88 بعدازاں جب وہ مکران کے حدود میں داخل ہوئے تو یقیناً اس خوف ناک جغرافیائی ہیبت اور بیابان کو اپنی زبان میں گیڈروش یا گیڈروشیا کہا۔ کہ جس کے معنی بقول کرنل موکلر کے ہیں "برے دن کے"89 کہ جسے بلوچی زبان میں بدروچ ترجمہ کیا جاتا ہے۔ کیونکہ بقول مؤرخین سکندر کو اپنی تمام سابقہ مہم میں سب سے زیادہ

تکلیف دہ اور پریشان کن صورتحال کا سامنا مکران میں کرنا پڑا تھا اور اسی لئے اس خطے کو انہوں نے گیڈروش کا نام دیا یعنی برے دن اور ساحلی خطے کے لوگوں کو کہ جنکی خوراک کا زیادہ تر ذریعہ مچھلی تھی، انھیں اتھیتا فیگوئی، یعنی مچھلی کھانے والے لوگ کہا۔90

تحقیق یہی ثابت کرتی ہے کہ درج بالا دیئے گئے نام یونانی مؤرخین اور فاتحین کی خودساختہ تھیں مگر ان کے ساتھ ایسے چمٹ گئے کہ کچھ نام آج بھی ان میں پائے جاتے ہیں جیسا کہ اربوئی نامی تفریحی مقام بمقام قلات سلسلہ کوہ اربوئی میں واقع ہے اور پورا پہاڑی سلسلہ اربوئی کہلاتا ہے اور یقیناً لفظ براہوئی جو کہ اسی سلسلہ کوہ کے قبائل کے قدیمی ساکن ہیں، اربوئی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اسی طرح گدور نامی قبیلہ اور گدر نامی مقام بھی بعض اوقات قدیم گیڈروشیا سے مماثل سمجھی جاتی ہیں۔ مگر حقیقتاً خطہ مکران کا قدیم نام مکران ہی تھا۔ جیسا کہ ہیروڈوٹس نے بیان کیا ہے اور اسکی تصدیق طبقات ابن سعد کے ایک بیان سے بھی ہوتی ہے91 اور یہ بیان دیگر کئی اسلامی مذہبی تواریخ میں بھی موجود ہے۔

"علاوہ ازیں ہیروڈوٹس کا درج ذیل بیان بھی اسکی تصدیق کرتا ہے کہ خطہ مکران کی وسعتوں میں ساحل بلوچ تک یہ قبائل پھیلے ہوئے تھے۔ یعنی، کچھ خانہ بدوش قبائل ہیں اور دیگر دریا کے ساتھ ساتھ دلدلی زمینوں میں رہنے والے لوگ کچی مچھلی پر گزارہ کرتے ہیں، جیسے وہ جھاؤ سے بنائی گئی کشتیوں میں شکار کرتے ہیں۔ یہ ہندوستانی سعادہ کا لباس پہنتے ہیں جسے وہ دریا سے کاٹتے ہیں پھر وہ اسے چٹائیوں کی صورت میں بنتے اور زرہ کی طرح پہن لیتے ہیں۔ جن قبائل کا یہاں ذکر ہوا وہ سب وحشی درندوں کی طرح مل کر رہتے ہیں۔ ان کی جلد کی رنگ بھی ایک جیسی اور ایتھوپیاؤں سے ملتی جلتی ہے۔ ان کا ملک فارس سے بہت دور جنوب کی سمت میں ہے۔ بادشاہ داریوش بھی کبھی ان پر حکمیت نہیں جتا سکا۔"92

مشہور مؤرخ اور ہندوستانی تہذیب کے علوم کے ماہر ڈی۔ ڈی کوسمبی بھی زمانہ قبل از تاریخ میں مکران کی بعینہٖ اسی نام ماگان یا ماکان کی موجودگی کا اعتراف کرتا ہے۔ لکھتا ہے کہ،

"وادیٔ سندھ کی تہذیب کانسی کے عہد سے تعلق رکھتی ہے اگرچہ چقماق نما بلور کے نفیس لمبے پتلے ٹکڑے چاقوؤں اور گھریلو اوزاروں کی حیثیت سے بدستور استعمال ہوتے تھے لیکن ہڑپہ، موہن جودڑو میں استعمال ہونے والے بہترین اوزار کانسی کے تھے جو بڑے مضبوط اور کارآمد

ہوتے تھے۔تانبے کے نہیں بلکہ اصلی کانسی کے جو کہ تانبے اور رانگ کا مرکب تھا اور کچھ دوسری دھاتوں کے اجزاء بھی اس میں شامل ہوتے تھے۔ کچا تانبا راجھستان سے آتا تھا۔اتنی کافی مقدار میں مہیا تھا کہ صاف شدہ تانبا مغرب کو برآمد کیا جاتا تھا۔ یہ نتیجہ بابل کی اور اس سے قبل تاریخی دستاویزات سے اخذ ہوتا ہے۔ علاقہ سندھ اور عراق کے درمیان سامان کے تبادلے کیلئے بڑا تجارتی مرکز خلیج فارس میں جزیرہ بحرین میں تھا۔عراقی روایات میں اسی کا نام "طلمون" تھا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سیریائی لافانی اور روحانی شخصیت نوحؑ نے عظیم طوفان سے بچنے کیلئے اپنے دن گزارے اور مجاہد غلغمیش (گل گامش) نے لافانیت کے راز کی تلاش میں اسے ڈھونڈ نکالا۔قدیم فارس کے پیکانی خط میں لکھی ہوئی مٹی کی الواح بتلاتی ہیں کہ بحرین کے راستے سے تاجروں کا ایک خاص طبقہ تجارت کرتا تھا جو "طلمون" کہلاتا تھا۔نئی کھدائیوں سے ان الواح کی کافی تصدیق ہو گئی ہے حالانکہ ابھی ایک لاکھ قبروں کے ڈھیر بغیر تحقیق کھلے پڑے ہیں۔سندھ کے شہروں اور میسو پوٹیمیا میں کچھ ایسی گول تکمانما مہریں ملی ہیں جو معلوم ہوتا کہ بحرین میں ایجاد ہوئی تھیں۔ بعد میں تاجروں نے سیریائی بادشاہ کی خصوصی حفاظت وشرکت میں تجارت کے منافع کا بڑا حصہ لے لیا تھا لیکن ان کا سب بڑا گاہک بھی ہوگا۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میسو پوٹیمیا کے لوگ سندھ کے علاقے کو "میلوہا" کہتے تھے۔1750ق م تک میلوہا کا تمام تذکرہ ختم ہو جاتا ہے جسکا مطلب ہے کہ اس وقت غالباً حملہ آوروں نے تجارت کے راستے روک دیئے تھے۔ایک اور درمیانی تجارتی مرکز ماگان یا ماکان بھی تھا جسکا مناسب سراغ نہیں لگ سکا۔ غالباً وہ ہندوستان (سندھ) اور بحرین کے درمیان کہیں ساحل پر تھا"۔93

اس اہم بیان کے بعد تو کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی کہ اس بات کو تسلیم نہ کیا جائے کہ مکران کا قدیم نام مکران ہی تھا جسے بعض اوقات ماکان یا ماگان بھی تحریر کیا گیا ہے۔ایسا ہی ایک قدیم ساحلی بندرگاہ کوہ باتیل گوادر کے قریب واقع ہے جو ایک پہاڑی کو کاٹ کر بنایا گیا ہے۔ یہ یقیناً وہ قدیم بندرگاہ تھی کہ جسکا اوپر کے سطور میں تذکرہ ہوا۔

یقیناً میکرونی اور موسی نوشی قبائل کا تعلق بھی مکران سے تھا کیونکہ مؤرخین کے مطابق ایران کے مشرقی علاقے کے قبائل نے میدی حکومت کے خاتمے کے ساتھ ہی شورش برپا کی تھی اور سائرس نے لیڈیا کی فتح کے بعد ان کی سرکوبی کو ضروری سمجھا اور ان کی گوشمالی کو روانہ

کیا۔94 مؤرخین بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ سائرس نے مکران پر حملہ کیا مگر اس کے نتیجے میں اسے شدید تباہی کا سامنا کرنا پڑا تھا اور وہ صرف سات سپاہیوں سمیت بچ نکلنے میں کامیاب ہوا تھا۔95

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تفسیر میں قرآن مجید کے سورہ کہف میں بیان کردہ شخصیت ذوالقرنین 96 کو تاریخ ساز شخصیت اور پہلا ہخامنشی فارسی فرمانروا سائرس اعظم کو قرار دیا ہے۔97 اور مولانا صاحب قرآن پاک کی آیات مبارکہ کی روشنی میں یہ ثابت کرتا ہے کہ سائرس نے اپنی مشرقی مہم کے پہلے حصے میں مکران کو تاخت کا نشانہ بنایا اور یہ واقعہ 545 اور 540 قبل مسیح کے دوران پیش آیا تھا۔ بعینہٖ یہی واقعہ فردوسی نے بھی بیان کیا ہے اور ان اقوام کو کوچ و بلوچ تحریر کیا ہے کہ جو بعدازاں ہخامنشیوں کے مضبوط بازو بن گئے۔

اتنے اہم ترین ذرائع اور مواد کی موجودگی کے بعد یہ ممکن ہی نہیں کہ خطہ بلوچستان (منقسم بلوچستان) میں بلوچ قبائل کی زمانہ قبل از مسیح میں موجودگی سے انکار کیا جائے جو یہاں زمانہ قدیم سے آباد تھے اور مضبوط جمعیت کے مالک تھے کہ جن کی افرادی قوت پر ایرانی شہنشاہ انحصار کرتے تھے اور ان کی ہر حال میں خوشنودی حاصل کرتے تھے۔اب اگر ایرانی فارسی حکومت سے پہلے یعنی قبل مسیح کے دوران بلوچ قبائل یہاں آباد تھے تو یقیناً آرین حملوں سے بھی قبل وہ یہاں آباد ہونگے۔

گوکہ ہمارے پاس کوئی ایسا مستند حوالہ یا ذریعہ نہیں ہے کہ ہم یہ دعویٰ کرسکیں کہ بلوچ قبائل آرین حملوں سے قبل یہاں آباد تھے لیکن بلوچ قبائل کی وسعت، علاقائی توسیع، پیچیدہ اور طویل قبائلی نظام، مضبوط جمعیت اور افرادی قوت وغیرہ کو دیکھتے ہوئے یہ وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ بڑے بڑے قبائلی گروہ یقیناً ایک دم سے یہاں وارد نہیں ہوئے بلکہ ان کے طریقہ زندگی اور طرز معاشرت کو دیکھتے ہوئے باآسانی کہا جاسکتا ہے کہ یہ یہاں زمانہ قدیم سے آباد تھے اور انھیں منظم ومربوط ہونے میں یقیناً صدیاں نہیں بلکہ ہزاروں سال لگے ہونگے۔ پہلے پہل خاندان اور بعدازاں ان کے ادغام سے چھوٹے طائفے بنے ہونگے۔ان طائفوں کے ادغام نے چھوٹے بڑے قبائلی گروہوں کو جنم دیا ہوگا۔ بعدازاں ان میں اکثر قبائلی گروہوں کا انضمام ہوتا جس کے نتیجے میں بڑے قبائلی گروہ تشکیل پاتے۔ یقیناً اس طرح کے عمل اور قبائلی معاشرے کی تشکیل میں

اتنا طویل عرصہ صرف ہوا ہوگا تو قومی دھارے میں آنے یا قومی تشکیل پانے میں اس سے بھی زیادہ طویل عرصہ لگا ہوگا۔

بلوچ قبائل کے ناموں سے بھی اس خیال کو زیادہ تقویت ملتی ہے کہ یہ کسی فرد واحد کی اولاد نہیں بلکہ کئی گروہوں کا مجموعہ ہیں۔ کیونکہ بلوچ قبائل کی اکثریت اجدادی ناموں کی بجائے علاقائی، شہریتی، پیشہ یا کسی واقعہ سے منسوب ملتے ہیں اور اس طرح کی سینکڑوں مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ مثلاً لاشار کے علاقے سے منسوب لاشاری 15 ویں صدی عیسوی میں 24 بلوچ قبائلی گروہوں پر مشتمل تھا اور اسکے اسلحہ بند نوجوانوں کی تعداد 44 ہزار تھی جبکہ رند قبائل 20 قبائلی گروہوں کا مجموعہ تھا۔ اسی طرح ایرانی بلوچستان میں واقع علاقہ بگٹ کا رہنے والا بگٹی، سرباز کا رہنے والا سربازی کہلاتا ہے۔ جو یقیناً علاقائی نام ہے اجدادی نہیں۔ ٹالپر اور بزدار قبائل اپنے پیشیوں یعنی اولذکر ٹالبر یعنی لکڑ ہارا اور ثانی الذکر بزدار یعنی چرواہا یا گلہ بان سے منسوب ہیں اور ایسے بے شمار مزید نام ملیں گے کہ جن سے بلوچ قبائل منسوب ہیں۔ کچھ نام اجدادی بھی ہیں مگر علاقائی یا دیگر حوالوں سے منسوب ناموں کی کثرت ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی مخصوص علاقے میں آباد تمام خاندانوں، طائفوں اور چھوٹے قبائلی گروہوں نے اپنے مفادات کی خاطر کسی بڑے گروہ کی شکل اختیار کی اور اپنی جمعیت مضبوط کرنے کے ساتھ ایک نئے نام سے بھی جانا جانے لگا اب۔ یقیناً یہ نام کسی ایک جد امجد کا نہیں ہوسکتا کیونکہ اس نئے اتحادیئے میں کئی اجداد سے تعلق رکھنے والے لوگ شامل ہیں لہٰذا نیا نام اجدادی ہونے کی صورت میں اختلافات بھی پیدا ہوسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بلوچ قبائل کے اکثریتی نام اجدادی نہیں ہیں۔

بلوچستان کا قبائلی نظام یقیناً ایک طویل سفر پر مبنی ہے اور میرے خیال میں اسکا آغاز ان قدیم ٹیلوں سے بھی پہلے ہو چکا تھا جو یہاں چہار سو پھیلے ہوئے ہیں۔ یقیناً زمین پر باقاعدہ آباد ہونے سے قبل یہ باشندے انہی کوہ و دمن میں اپنے مال مویشی سمیت گھومتے پھرتے اور چھوٹی برادریوں (خاندانوں) میں منقسم تھے۔ یہی خانہ بدوش ان قدیم ٹیلوں کے اولین آباد کار تھے اور ان ہی برادریوں نے گروہوں کی شکل اختیار کی اور کئی گروہ مل کر مضبوط قبیلہ بن جاتا۔ حتیٰ کہ تحقیق یہ ثابت کرتی ہے کہ یہ قبائلی یک جہتی اور قوت بڑھانے کا سلسلہ آرین حملوں تک مکمل ہو چکا تھا اور یہ قبائلی گروہ بلوچستان کی وسعت میں منقسم اتحادیوں (Confederacies) میں رہتے تھے۔

اور جب خطہ ایران پر آریائی خاندانوں نے اپنا تسلط جما لیا تو یقیناً ان صحراؤں، میدانوں اور پہاڑوں میں رہنے والے قدیم اور آزاد منش لوگوں کو بلوچ کا نام دیا۔

یہی وجہ ہے کہ مسلم تاریخ نویسی کے امام عبدالرحمان ابن خلدون ان قبائل کے ایک حصے کو، جو دشت لوط آباد تھے، بادیہ نشین (صحرانشین) لکھتا ہے اور بعض اوقات انکے علاقائی نام جیسے جاسکیہ، حردسکیہ وغیرہ بھی تحریر کرتا ہے۔98 یقیناً ان قبائل کو ابتدائی فارسی حکمرانوں نے یہ نام دیا ہوگا اور ان سے پہلے یہ قبائل بلاشبہ بڑے بڑے گروہوں میں منقسم تھے اور مختلف علاقوں پر قابض و حکمران تھے۔ ان علاقوں میں شمالی ایران، سیستان، دشت لوط، کرمان، مکران، توران اور جنوبی افغانستان وغیرہ شامل تھے۔ ان تمام قبائل کو فردوسی شاہنامے میں جبکہ تمام عرب مورخین اپنی اپنی تواریخ میں کوچ و بلوچ کا نام دیتے ہیں اور یونانی ان کے بڑے قبائلی گروہوں کے نام تحریر کرتے ہیں۔

ڈی۔ ڈی کوسمبی ان قدیم قبائل کی اولین تہذیب اور آریاؤں کے ہاتھوں ان قبائل کے قدیم ترین دیہات سسٹم کی تباہی کا تذکرہ یوں کرتا ہے۔

"ان (آرین) کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا عظیم دریائی ثقافتوں سے بہت دور تیسرے عہد ہزار سالہ قبل مسیح کے جو چھوٹے چھوٹے مہر بند و محدود اور زیادہ تر انحطاط پذیر دیہاتی فرقے تھے۔ ان کی درمیانی حد بندیوں کو بڑے وحشیانہ طریقے سے مسمار کر ڈالا۔ آریاؤں کو جو مقامی تیکنیک اپنے لئے مناسب نظر آئی وہ انہوں نے اپنالی اور آگے چل دیئے۔ جو بربادی وہ پیچھے چھوڑ جاتے تھے وہ پامال شدہ لوگوں کیلئے ناقابل تلافی تھی"۔99

کوسمبی ایک جگہ مید قبائل کا تذکرہ کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ وہ فارسیوں سے قبل ایران پر حکمران تھے۔ البتہ بعض مؤرخین کی طرح وہ انہیں قدیم آریائی دھڑا لکھتا ہے"۔100

وہ قبائل کہ جنہیں فردوسی نے کوچ و بلوچ کہا انھیں کوسمبی ہیرکانی (کاسپیانی) گیلانی اور مازندرانی لکھتا ہے اور انھیں ہندی آریائی گروہ قرار دیتا ہے"۔101 حالانکہ دیگر کئی مستند مؤرخین انھیں غیر فارسی اور آرین سے قدیم اقوام تحریر کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں بے شمار بلوچ قبائل کا تذکرہ بابائے تاریخ ہیروڈوٹس (Herodotus) کے حوالے سے عزیز براہوی نے بھی کیا ہے جن میں اکثر قبائل آج بھی وجود رکھتے ہیں۔ ان قبائل

کے درج ذیل نام انھوں نے بیان کیئے ہیں۔

(1) سگارتوئی۔(2) زرنجی۔(زرنج کے رہنے والے)۔(3) تھامائی (یہ اب بھی موجود ہیں)۔ (4) اغوئی (یہ اب بھی موجود ہیں) (5) میکوئی (میکرونی) (6) پری کونائی۔(7) کوشائتی (نام کی تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ یہ بھی اب تک موجود ہے کوشانی یا گورچانی)۔(8) گدرا (یہ بھی اب تک موجود ہے)۔(9) بلدائی (بلیدی کے نام سے ایک بڑا قبیلہ)۔(10) مید (11) ساجدی (ایک بڑا اور مشہور قبیلہ ہے جو جھالاوان اور آواران میں آباد ہیں)۔(12) کف (یہ ایک چھوٹے سے قبیلے کی صورت میں اب بھی موجود ہے)۔(13) بیلوس (پشتو میں بلوچ کیلئے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے اور ایک محدود قبیلہ بھی ہے اور اس کے علاوہ قندھار سے کوئٹہ تک کے علاقے کا قدیمی نام بھی ہے اور قندھار شہر کا نام بھی تھا) (14) طائی مانی۔(15) شنسی۔(16) سقہ۔(17) ناہروئی (یہ ایک قدیم قبیلہ ہے جو عدد اور قبائلی لحاظ سے بڑا قبیلہ کہلاتا ہے جو سیستان اور دشت لوط میں وسیع رقبے پر آباد ہیں) (18) پاری کانی۔102

اسی طرح ہیروڈوٹس ایک اور مقام پر بلوچوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ۔

ہندوستانی (سندھی و پنجابی) سپاہی سوتی وردیاں پہنے ہوتے تھے اور تیر و کمان سے مسلح تھے ان کے تیروں کے پھل لوہے کے تھے اور ان کا سالار ارتابتیس کا بیٹا فرناز اتفرس تھا گندھارا اور ودی سائی کے پرے ارتابانس کے بیٹے ارتی فائس کی کمان میں تھے اور پاری کانی (بلوچ) سپاہ کا کماندار سیرومترس تھا۔ یہ لوگ بھی پختائیوں (پختونوں) کی طرح چمڑے کی صدریاں پہنے ہوئے تھے اور تیر و کمان اور خنجروں سے آراستہ تھے۔103

مندرجہ بالا بیانات اور شواہد کی روشنی میں یہ کسی طرح مناسب اور موزوں نہیں کہ ایک قوم جو ماقبل تاریخ سے یہاں آباد ہو اسے ایک مہاجر کا نام دیا جائے۔ لہٰذا کسی طور اس بات کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ بلوچوں کا براہوئی طائفہ کوہ البرز سے آئے ہوئے مہاجر ہیں اور لفظ برز کوئی بگڑ کر براہوئی یا بروہی میں تبدیل ہوا ہے۔

(جھلاوان میں براہوئی قبائل کا ذکر اربوئی قبائل کے نام سے گزشتہ صفحات میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوچکا ہے)

دوسرے طائفے کا ذکر کرتے ہوئے میر گل خان نصیر لکھتے ہیں کہ یہ طائفہ حلب اور دجلہ و

فرات کے کنارے آباد تھا اور حجاج کے دور میں وہاں سے نکالا گیا کیونکہ انھوں نے بقول میر گل خان نصیر معرکہ کربلا میں حضرت امام حسینؓ کی مدد کی تھی اور دیگر اہل بیت کا ساتھ دیا تھا۔

یہ محض ایک قیاس آرائی اور داستان کے سوا کچھ نہیں۔ دراصل میر گل خان نصیر نے اس واقعے کی صداقت اور بیان کیلئے رندی شاعری کی مدد لی ہے جس میں رند اپنی مظلومانہ ہجرت، حضرت امام حسینؓ اور حضرت علیؓ کی حمایت اور حجاج بن یوسف کیساتھ لڑائیوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ یہ کہانی منظوم انداز میں ہے 681ء واقعہ کربلا سے شروع ہوتی ہے اور پندرھویں صدی عیسوی تک پہنچ جاتی ہے۔ اس پوری نظم میں رند بلوچ شاعروں نے بلوچ قومی ارتقاء کی داستان بیان کی ہے کربلا کے واقعے سے لیکر رند و لاشار قبائل کی سبی، کچھی، گنداواہ میں آبادکاری کی یہ پوری داستان اس حقیقت کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ اس شاعری میں کس حد تک واقعات کی سچائی بیان کی گئی ہے کیونکہ بعض مؤرخین اسی شاعری کو ہی بنیاد بنا کر بلوچ نسلی اصلیت کو عربی نسل نظریے سے منسلک کرتے ہیں اور بعض حضرات اسی نظریے یا شاعری کی بنیاد پر بلوچوں کا تعلق حضور پاک ﷺ کے چچا حضرت امیر حمزہؓ کو قرار دیتے ہیں وہ اشعار یوں ہیں۔

شکر اللہءِ حمد گذاراں بادشاہ ملکے ہماوث ءِ نت
کل جہاں ہاخ گل بخث وث کوشی یک و تھنبا
مامریدوں یاعلی ءِ دین و ایمان ثبت ءَ نت
امتوں پاکیں نوی ءِ کہ جہاں ءِ واثرہ ئت
اولادوں ما میریں حمزہ ءِ اژ حلبءَ بھاژ کا یوں
گوں یزیدءِ جھیڑو ئیت صوب درگاھا گورئیت
کربلا بمپورءِ نیاما ملک سیستان میزل ئت
بادشاہ کے شمس الدین گوں بلوچاں حاطر ئت
نی کہ بدر الدین در آتکہ ناغمانیں شدت ئت
مئے سر میریں جلال ہاں گوں چھل و چھار بولک ئت
کا تکریں ھاریں بندرا کیچ ءِ راستیں پلوا
ہوت سندیں مکرانءَ کھوسغ ماکیچ ءِ ھا

ہوت و کورائی اواراں　　اے ماں لاشار گھر ئنت
دریشک و حوت و مزاری　　اے گوں رندءِ یک سریں ئنت
رند ولاشار ماں ملک ءَ　　سیم گون نیا منع ءَ ئنت
مستریں لوغ ڈومبکی ئیگ　　گاج سیاہ آف سرئنت
اژ حلب ءَ چانڈیہ گون ئنت　　کلمتیں ءِ لوغ پہ گورئنت
نوح تندی ماں تلیءَ　　جتکانی پہ گورئنت
پھنو میر عالی جتوئی　　ورست سیوی ڈھاڈرئنت
اژبنیاد ا پھٹر رندئیت　　سرگوں میریں چاکرئنت
گولہ و گوپانگ و دشتی　　اژ رند تھالی ء درئنت
دورشتک پہ گورگیژئنت　　آں ماں تلی ءِ درئنت
تحی بلوچ بارو بشاریں　　درست ماں رندءِ مناہ ئنت
رند ماں شوران ءَ تندی　　لاشار ماں گنداوغ ئنت
چوو میان بہر کناناں　　کل سردار شہک ئنت
شہک و سحاق رندا　　لس سردار چاکر ئنت
چہل ہزار کیت میرءِ گوانکا　　تھیوغا رند پڑ ئنت
ہول پوش دست کرائی　　دراہ کمان و جائنت
کاڑچ و کاٹار زنفریں　　دست مندری تھنگوئنت
بکر و گواہرام و رامین　　زر زوال نوذ بندغ ئنت
پھنو جاڑو جور جواویں　　حدہ دین ءِ برادرئنت
پیروز شاہ بجار ریحان　　باہر گوں شاہی بیور غ ءِ
رنداں حس مولانغ ئنت　　درستاں میرھان تیغ زن ئنت
صوبھا میتاں و عالی　　جام سحاق والف ئنت
ھیوتا ں بیورغ مارنداں　　میر حسن گوں براھم ئنت
پھلویں سی سال جنگ ئنت　　اے بلوچانی شدت ئنت

اے منی پیرا ورندئنت　　اے بلوچ ءِ دپتر ئنت
شاھر کہ شیراں گوشی　　میر جلال ہاں سرپدئنت 104

مندرجہ بالا شاعری کو بنیاد بنا کر اکثر مؤرخین بلوچوں کو حلب سے آنے والا طائفہ یا گروہ سمجھتے ہیں بعض ان کے بلوچ ہونے سے انکار کرتے اور انھیں علاقی عرب لکھتے ہیں۔ اور اکثر مؤرخین تو اسی شاعری کی بنیاد پر رندوں کو تمام بلوچوں کا جدامجد قرار دیتے ہیں لیکن یہ تحریر کرتے وقت وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ بلوچ قبل مسیح میں بھی موجود تھے۔ رہی بات اس مظلومانہ ہجرت کی جو معرکہ کربلا میں حسینؓ کی طرفداری کی پاداش میں بلوچوں کو بھگتنا پڑا اور انھیں ترک وطن پر مجبور ہونا پڑا تو یہ سب ایک افسانہ اور کہانی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ جسطرح پچھلے سطور میں ذکر ہوا کہ معرکہ کربلا 681ء میں پیش آیا جس میں گورنر کوفہ عبید ابن زیاد نے نواسہ رسول ﷺ حضرت امام حسینؓ کو اس کے 72 رفقاء کے ساتھ کربلا کے میدان میں شہید کر دیا تھا۔ شامیوں میں حر بن یزید تمیمی نے اس کا ساتھ دیا تھا اور اس معرکے میں شہید ہو گئے تھے امام حسینؓ کے دیگر رفقاء ان کے عزیز و اقارب اور رشتہ دار تھے جبکہ حر بن یزید تمیمی بنو تمیم کا سردار تھا 105 اور بنو امیہ کے دور میں جہاں تک بلوچوں کی کسی شورش یا حلب اور اس سے متصل کسی علاقے میں ان کی کسی جنگ یا موجودگی کا تذکرہ کتب تاریخ میں نہیں ملتا کم از کم اتنے بڑے واقعے کو تاریخ اسلام کی کسی کتاب میں ضرور تحریر ہونا چاہیے تھا مگر ایسا نہیں ہے۔ لہٰذا اس رندی شاعری کو بنیاد بنا کر کسی قوم کی تاریخ مرتب نہیں کی جا سکتی دوسری بات یہ کہ یہ شاعری یا تو عہد در عہد ہوتی چلی آئی ہے (جس میں نسلی ماخذ کو بیان کیا گیا ہے) یا پھر رند ولاشار کے 30 سالہ بدترین خانہ جنگی کے بعد رقم ہوئی ہے یا اسی دوران ہوتی رہی ہے موخر الذکر رائے تقریباً درست ہے کیونکہ شاعر بھی آخر میں یہی کہتا ہے۔

پھلویں سی سال جنگ ئنت　　اے بلوچانی شدت ئنت

اب ایک ایسی شاعری جس میں 38 اشعار میں تقریباً 900 سو سالوں کی تاریخ اور ادوار کا احاطہ کیا گیا ہو یعنی اپنی ہجرت کے 900 سو ہا سال بعد ان اشعار کو یا بالفاظِ دیگر اس کہانی کو بنایا گیا ہو اور بغیر کسی تحقیق کے یا کسی تاریخی کتب کے حوالے سے شاعر نے ایک کہانی ترتیب دی بعد ازاں گویوں نے اسی کہانی کو مزید مرچ مصالحہ کے ساتھ بطور بلوچ نسلی ماخذ پیش کیا اور سادہ لوح بلوچ نے اس شاعری کو من وعن نسلی اصلیت تسلیم کر لیا۔ اب ایسے مواد پر جو بغیر کسی تحقیق اور تفتیش

کے زبانی کلام کی صورت میں سامنے آئے تو اس پر کیسے یقین کیا جا سکتا ہے اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ اس زبانی کلام نے بیسویں صدی کے آغاز یا انیسویں صدی کے آخری عشرے میں تحریری صورت اختیار کی ہے۔

لہٰذا پہلے طائفے کی طرح دوسرا طائفہ اور اسکی حقیقت بھی افسانوی ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں نہ تو بلوچوں نے معرکہ کربلا میں حصہ لیا تھا نہ ہی ان کی یزید سے جنگیں ہوئی تھیں اور نہ ہی انھوں نے ہزاروں یا لاکھوں کی تعداد میں حلب سے کوئی ہجرت کی تھی بلکہ رند و لاشار اور دیگر بلوچ قبائل کا تعلق (ایران) مکران سے ہے جہاں یہ فہرج، قصر قند، لاشار، مگس، بگٹ، دشتیار، بیر جند، جیرفت، بم، بشگرد، ڈومبک اور ساحل ہرمز تک پھیلے ہوئے تھے اس کے علاوہ موجودہ مکران میں بھی ان کی بڑی اکثریت آباد تھی نویں اور دسویں صدی عیسوی میں غزنویوں اور بعد ازاں عضد الدولہ آل بویہ کے ساتھ طویل جنگوں نے سینکڑوں بلوچ قبائل میں سے صرف ان ہی قبائل کو ان کی سرکشی کی بناء پر دشت لوط سے مکران کے پہاڑوں تک پہنچایا اس کے بعد مکران میں ان قبائل نے دوبارہ قوت پا کر آل بویہ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ بعد ازاں غزنوی اور غوری عہد میں بھی مکران سیستان اور دشت لوط میں یہ سلسلے جاری رہے۔ پندرہویں اور سولہویں صدی عیسوی میں مکران میں قحط سالی اور دیگر نامساعد حالات کی وجہ سے ایک بار پھر مکران اور ایرانی بلوچستان میں شامل کئی علاقوں سے بلوچ قبائل کی ایک بڑی تعداد نے زرخیز اور گرم علاقوں کی طرف نقل مکانی کی۔ بعد ازاں قلات اور پھر کچھی و گنداواہ سمیت سبی کے میدانوں میں آباد ہو گئے مگر چند قبائلی رنجشوں کی بنا پر ان قبائل میں خونریز جنگیں ہوئیں جس میں ان کی ایک بڑی تعداد کھیت رہی اور کثیر تعداد نے سندھ، پنجاب اور ہندستان کی جانب ہجرت کی اور آج بھی ان کی ایک بہت بڑی جمعیت ان علاقوں اور ممالک میں آباد ہے۔

اس کے علاوہ یہ بھی دیکھا جائے کہ اسلامی (عرب) افواج نے 23 ہجری بمطابق 644ء میں مکران فتح کر لیا تھا تاریخی کتب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت مکران کے باشندے کوچ و بلوچ تھے جنھوں نے کرمانیوں کی مدد کی تھی۔ 106 کرمان کو مکران سے قبل اسی سال ہی میں فتح کر لیا گیا تھا اور بعض مؤرخین کے مطابق کرمان کے باشندے بھی اس وقت بلوچ تھے جنھیں کوچ یا کُنج کہا جاتا تھا۔ 107 کیونکہ وہ کرمان سے متصل کُنج یا قفص کے پہاڑوں (پہاڑی

قلعوں) میں سکونت رکھتے تھے۔ اگر 23ء ہجری میں بلوچ مکران میں موجود تھے تو پھر یہ 61 ہجری یا 681ء میں کربلا میں کیسے پہنچے اور کس طرح یزید سے لڑے اور شکست کھائی اور پھر سیستان آئے یعنی بلوچستان کی فتح کے پورے 38 سال بعد بلوچوں کا ایک طائفہ ڈرامائی انداز میں مکران میں وارد ہوا اور بلوچوں کو متعارف کروایا۔ اب یا تو یہ قدیم تحریری بیانات غلط ہیں یا پھر رندی شاعری میں مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔ اور یقیناً ثانی الذکر بات درست ہے۔

عرب مؤرخین اور سیاح کبھی دشت لوط اور مکران سمیت بلوچستان کے کئی دیگر شہروں میں بلوچوں کی موجودگی کا تفصیل کے ساتھ تذکرہ کرتے ہیں اس ضمن میں المقدسی لکھتا ہے۔

"تمام مفازہ (دشت) آوارہ گرد بلوص (بلوچ) قبائل سے خوفزدہ رہتا تھا ان کے قلعے صوبہ کرمان کی سرحد پر قفص کے پہاڑوں میں تھے یہ لوگ وحشیوں کے سے چہرے رکھتے تھے قسی القلب تھے نہ اخلاق جانتے تھے نہ آداب کوئی ان سے بچ کر نکل نہ سکتا تھا اور جن پر قابو چل گیا انھیں پتھر مار مار کر ہلاک کر ڈالتے تھے جس طرح کوئی سانپ کا سر کچلے اسی طرح آدمی کے سر کو پتھر پر رکھ کر پتھروں سے کوٹ کوٹ کر اسے چورا کر ڈالتے تھے"۔ 108

اس طرح کے بے شمار بیانات اور اقتباسات سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ اگر صرف ان بیانات کو جمع کیا جائے تو یہ بذات خود ایک ضخیم کتاب بن جائیگی۔ بہر حال وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ میر گل خان نصیر اور اسی مکتبہ فکر کے دیگر مؤرخین کی یہ رائے کہ بلوچ حلب سے آئے اور پھر سیستان و مکران کے بعد قلات اور یہاں سے کچھی گنداواہ پہنچتے پہنچتے رند و لاشار بن گئے درست نہیں ہے۔

ناہروئی طائفہ دراصل وہ قدیم بلوچ ہیں جو ما قبل تاریخ سے افغانستانی سرحدات اور دشت لوط سمیت سیستان کے ایک وسیع رقبے پر آباد رہتے چلے آ رہے ہیں۔ ایرانی اور سیستانی حکمرانوں کے درمیان ہمیشہ یگانگت اور دوستی رہی اور سیستان کے بلوچوں نے ہر ایرانی حکومت کے استحکام اور بقاء کیلئے لازوال قربانیاں دیں وسط ایشیائی خطے کی ایران میں الحاق اور اسکی فتح اور ساتھ ہی توران کی سلطنت کا خاتمہ انہی سیستانی ناہروئی بلوچوں کے مرہون منت ہے۔ ان ناہروئی بلوچوں میں رستم اور اسکے والد زال کے کارنامے تاریخ کے صفحات پر زریں حروف میں لکھے گئے ہیں۔ رستم بلوچ اور سیستان کے ذکر کے بغیر شاہنامہ فردوسی کی حیثیت ایک ردی اخبار سے زیادہ کچھ

نہیں۔ رستم جو کہ شاہنامہ کا ہیرو اور مرکزی کردار ہے وہ بلوچ ہے اور بحیرہ کیسپئین سے لیکر بولان کے پہاڑوں اور بلمند سے لیکر ساحل مکران تک اس کی عظیم اور طاقتور قوم پھیلی ہوئی ہے۔ لہٰذا شاہنامہ نہ صرف بلوچ ایرانی جنگوں کا تذکرہ کرتا ہے بلکہ انہی کے سہارے ایرانی حکومت کے استحکام اور ترقی کو بھی نظم کی صورت میں پیش کرتا ہے اور یہی شاہنامہ فردوسی کی خوبصورتی اور اہمیت ہے دراصل یہی وہ بلوچ تھے جو ایران اور توران دونوں ممالک کے افواج کے اہم دستے شمار کیئے جاتے تھے اور جب حکمرانوں سے اختلافات کی وجہ سے انھیں فوج کشیوں کا سامنا کرنا پڑتا یا کوئی بیرونی حملہ آور ان پر حملہ آور ہوتا تو وہ پہاڑ در پہاڑ دور نکل جاتے اور کچھ عرصے بعد دوبارہ اپنے مساکن کی جانب لوٹ آتے تاریخ سے نابلد اور ناواقف افراد نے ان کی اس دربدری کو خانہ بدوشی سے تعبیر کیا۔

لہٰذا میر گل خان نصیر نے بلوچوں کو جن طائفوں میں تقسیم کیا ہے اور پھر ڈرامائی انداز میں ان کے ملاپ کی جو کہانی پیش کی ہے اسکا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ ایک افسانہ ہے جس نے بلوچ تاریخ کو مزید الجھا دیا ہے۔ ملک صالح محمد خان لہڑی، پروفیسر محمد اشرف شاہین قیصرانی، پروفیسر عزیز بگٹی اور بعض دیگر بھی اسی نظریے کی پیروی کرتے ہیں۔

جہاں تک میر جلال خان کا تعلق ہے اور جن کے چار بیٹوں کا ذکر کیا جاتا ہے اس شخصیت اور اس سے منسلک واقعہ حقیقی سے زیادہ افسانوی لگتا ہے اگر اسے حقیقی مان بھی لیا جائے تو بھی اس کیلئے کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے ماسوائے اسی رندی شاعری کے جسکا تذکرہ اوپر کے سطور میں ہو چکا ہے۔ ان اشعار کے علاوہ اور کوئی تاریخی دستاویز موجود نہیں جو میر جلال خان اور اس کے اولاد کی نشاندہی کر سکے اور اگر یہ اشعار تحریری شکل میں ہوتے تو بھی کسی حد تک ان پر بھروسہ کیا جا سکتا تھا مگر 900 سالوں کی طویل کہانی پر مبنی یہ اشعار پندرہویں اور سولہویں صدی عیسوی یا اس سے بھی قبل گویوں نے گایا اور انیسویں صدی عیسوی میں انگریزوں نے اسے تحریری شکل دی۔ اس طرح اس کہانی کی کل عمر تقریباً 1200 سال کے لگ بھگ بنتی ہے اب اس زبانی مواد کی صداقت پر کس طرح بھروسہ کیا جائے سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔ ہمارے اکثر مؤرخین سرداروں اور مشہور شخصیات کو اس طرح بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں کہ اگر ان کی شخصیت حقیقی بھی ہے تو بھی افسانوی یا مافوق الفطرت بن جاتی ہے مثلاً نور احمد فریدی نے جو مشرقی بلوچستان کے رند بلوچ

قبائل سے تعلق رکھتا ہے انہوں نے اپنی تالیف "بلوچ قوم اور اسکی تاریخ" میں سردار میر چاکر خان رندکی شخصیت کو نہ صرف افسانوی بنادیا ہے بلکہ اسے واقعی ایک مافوق الفطرت انسان بنادیا ہے۔ ان کا بیان تو بہت طویل ہے ذیل میں اسکا اختصار دیا جارہا ہے۔ لکھتا ہے کہ:-

"جب نلی کی جنگ میں لاشاریوں نے رندوں کو شکست دی تو سردار چاکر خان اس شکست کا بدلہ لینے کیلئے کمک کے حصول کی خاطر ارغونوں کے پاس افغانستان، قندھار چلا گیا۔ ارغون بادشاہ نے اسکی عزت افزائی کی اور اس کی کہانی سن کر اسکی امداد پر آمادہ ہوا۔ اسی دوران لاشاریوں کا ایک وفد گوہرام لاشاری کے بیٹے میر بی بکر کی سرکردگی میں قندھار پہنچ گیا اور ارغونوں کو میر چاکر خان کی مدد سے دستکش ہونے کی استدعا کی۔ ارغون بادشاہ لاشاریوں کے تحفے دیکھ کر شش و پنج میں پڑ گیا کیونکہ اس نے رند سردار سے مدد کا وعدہ کیا ہوا تھا اور اسے ہر حال میں اپنا وقار بحال رکھنا تھا لیکن لاشاریوں کی منت سماجت اور تحفے بھی ملحوظ رکھنا تھا۔ بادشاہ کو ایک تجویز سوجھی اور اس نے میر چاکر خان کی بہادری کا امتحان لینے کا فیصلہ کیا پہلے رند سردار کا مقابلہ ایک مست ہاتھی سے ہوا جسے بغیر کسی ہتھیار کے میر چاکر نے میدان سے بھگا دیا اس کے بعد ایک وحشی گھوڑے کا مرحلہ آیا اس پر میر چاکر نے کامیابی کے ساتھ سواری کر کے میدان مار لیا جبکہ تیسرا اور آخری مرحلہ پر میر صاحب کا مقابلہ ایک بھوکے شیر سے ہوا اس میں بھی میر چاکر خان کامیاب و کامران ہوئے اور شیر کو قتل کر کے میر صاحب نے میدان جیت لیا کمالات میں کامیابی کے بعد ارغونوں نے میر چاکر خان کی مدد کی اور اپنی افواج اس کے ساتھ کر دیئے۔ 109 اس طرح کے بیانات سے مولانا نور احمد فریدی اور دیگر مؤرخین چاکر سمیت دیگر اہم شخصیات کو بھی اساطیری اور مافوق الفطرت بنا دیتے ہیں جنکی تاریخ میں کوئی مسلم حیثیت نہیں ہوتی اور نہ ہی انھیں تاریخ میں کوئی سند حاصل ہے کہ من و عن ان واقعات پر یقین کیا جا سکے۔ شاعر کی فطرت ہوتی ہے کہ قصیدہ، غزل، نظم، ہجو اور شاعری کے دیگر اصناف کو خوب مرچ مصالحہ لگا کر پیش کرتا ہے تاکہ سننے والے خوب محظوظ ہوں۔

افغانستان، ایشیائی یا وسطی ایشیاء کی کسی تاریخی دستاویز یا کتب میں ان واقعات کی کوئی تفصیل نہیں ملتی جس سے صاف ظاہر ہے کہ رندوں کے قومی شاعر نے اپنے سردار کی شان میں وہ قصیدہ گوئی کی ہے جو ہر قومی شاعر اپنے قومی، قبائلی، علاقائی اور خاندانی ہیرو کی شان میں کرتا ہے۔ لہٰذا میر جلال خان کی جس شخصیت کی تصویر کشی کی جاتی ہے دراصل وہ اصل واقعات اور حقیقت

سے ہٹ کر ہے۔ جلال خان کی اصل شخصیت مکران میں ابھرتی ہے اور وہیں پر وہ اکثر منتشر بلوچ قبائل کو یکجا کر کے ایک بڑی قوت اور عظیم جمیعت بناتے ہیں۔ بلوچ یکجہتی اور اتحاد کیلئے کی جانے والی اسکی گراں مایہ خدمات نے اسے بلوچوں میں اتنا مقبول اور معزز بنا دیا کہ شاعروں نے اسے بلوچوں کے جداعلیٰ سے تشبیہ دی۔ ان کی شخصیت کو انتہائی افسانوی بنا کر مستقبل کے مورخ کو اصل حقائق سے آگاہی کیلئے مشکل میں ڈال دیا۔

اس طرح کے بے شمار بلوچی اشعار موجود ہیں جن میں اصل واقعات و شخصیات کے کارناموں کو مرچ و مصالحہ لگا کر نجانے کیا سے کیا بنا دیا گیا ہے ان اشعار کے مطالعہ کیلئے بلوچی کہنیں شاعری از شیر محمد مری، بلوچی کہنیں شاعری از جسٹس خدا بخش بجارانی مری A Literary History of Baloches از محمد سردار خان بلوچ اور Popular Poetry of Baloches از Long Worth Dames وغیرہ کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

بلوچی زبان کے معروف ادیب و شاعر سید ظہور شاہ ہاشمی مرحوم بلوچوں کو نسلاً آرین لکھتے ہیں اور مشہور ہخامنشی آرین خاندان کو بلوچ کہتے ہیں۔110 ڈاکٹر شاہ محمد مری بھی اس نظریے کی تائید و حمایت کرتے ہیں۔111

سید ظہور شاہ ہاشمی اپنی اسی کتاب میں اپنے اسی نظریے کی بعد ازاں خود ہی نفی کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ شیخ سید عبدالقادر جیلانی (گیلانی) بھی بلوچ تھے۔112 اب یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ شیخ عبدالقادر گیلانی ایران کے صوبہ گیلان میں پیدا ضرور ہوئے مگر ان کے والد ہاشمی عرب تھے نہ کہ بلوچ اور جہاں تک آرین کا تعلق ہے تو تاریخ کی کتابیں ہمیں کچھ اور بتاتی ہیں ان میں مذکور ہے کہ "بلوچ میدی اور ہخامنشی افواج میں شامل تھے اور ان افواج میں اسوارن کے نام سے پہچانے جاتے تھے اور ساتھ ہی ان کے قبائلی اور علاقائی یعنی شہریتی نام بھی ہوتے تھے"۔113 میدی سلطنت کا آغاز 854 ق م میں ہوا اور بعض 835 ق م بھی تحریر کرتے ہیں۔114 جہاں تک بلوچوں کے آرین ہونے کا تعلق ہے تو ان کا علاقائی محل وقوع، جسمانی ساخت، ثقافتی اقدار اور معاشرتی زندگی اس بات کی نفی کرتے ہیں اس کے علاوہ بلوچ قبائل آرین حملوں سے قبل موجودہ ایرانی، افغانستانی اور پاکستانی بلوچستان میں اپنے قدیم قبائلی نظام اور قبائلی تحفظات کے تحت زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے ہاں قدیم سیاسی اشتراکی نظام قائم تھا جسکی مثال

اب بھی بلوچستان کے اکثر علاقوں کی دی جا سکتی ہے۔ جہاں اب بھی بلوچوں کے اکثر قبائل قدیم اشتمالی (اشتراکی) نظام کے تحت زندگی گزارتے ہیں۔115 جبکہ اس کے برعکس آرین خانہ بدوش تھے ان کا معاشرتی نظام اور ثقافتی اقدار مختلف تھے اور سب سے بڑھ کر ان میں بدترین طبقاتی نظام موجود تھا اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ آرین ہیں تو ان سے پہلے کے جو لوگ تھے جن کی آبادیوں کے لاتعداد آثار ٹیلوں، مدفنوں، قبرستانوں اور دیگر آثار کی شکل میں یہاں موجود ہیں وہ کہاں چلے گئے۔ لہٰذا یہاں ایک یہ سوال اٹھتا ہے کہ وہ لوگ کون تھے جنہوں نے برسوں آرین حملہ آوروں کا مقابلہ کیا؟ جن کی جدوجہد کے نتیجے میں آخرکار آرین یہاں سے چلے گئے۔ مگر یہاں کے قدیم باشندے اپنی سرزمین اور تہذیب کیساتھ جڑے رہے۔

میر احمد یار خان بلوچوں کو حلب کے باشندے تحریر کرتا ہے اور انھیں کئی دیگر مؤرخین کی طرح عرب قرار دیتا ہے۔116

بعض اقوام اقتدار کے حصول کی خاطر اپنا نام و نسب اعلیٰ خاندانوں یا حکمران خاندانوں کے ساتھ جوڑتے ہیں تاکہ دنیا میں اپنے آپ کو اعلیٰ و ارفع ثابت کر سکیں اور اقتدار کی کرسیوں پر ہمیشہ براجمان رہ سکیں۔ اس میں حیرت کی بات نہیں ہے جسطرح سندھ کے کلہوڑے اور بھٹو اپنے آپ کو عباسی عرب کہتے ہیں۔117 اسکی بنیادی وجہ یہی ہے کہ ماضی میں بھی چونکہ سندھ پر ان کا اقتدار رہا ہے مغل دور میں یہ خاندان سندھ کے تاج و تخت پر متمکن تھے لہٰذا شاہی درباریوں اور مؤرخین سے جو شجرہ نسب لکھوایا گیا اس میں اپنا نسب عباسیوں کے ساتھ جا ملایا اور عباسی عرب کہلائے۔ وہ زمانہ چونکہ جابرانہ ملوکیت کا تھا تقریباً پوری دنیا میں مختلف خاندان برسراقتدار تھے لہٰذا جہاں جس اعلیٰ خاندان کو سب سے اعلیٰ مقام و مرتبہ حاصل ہوتا وہاں کے مقامی سلاطین، خوانین، راجے اور لارڈ اپنا رشتہ اسی خاندان کے ساتھ کسی نہ کسی طرح کئی پشت پیچھے لیجا کر جوڑ لیتے تھے چونکہ مسلمانوں میں عرب کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے اور انھیں نہ صرف نبوت کا وارث بلکہ اولین مسلمان اولین حکمران، اولین مبلغ اور حضور پاک ﷺ کے ناطے سب سے اعلیٰ خاندان تصور کرتے ہیں لہٰذا اکثر و بیشتر اقوام اپنا نام و نسب کسی نہ کسی حوالے سے عربوں کیساتھ جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسکی ایک اور مثال درانیوں کی دی جا سکتی ہے۔

دردران صرف افغان حکمران احمد شاہ ابدالی (1747ء تا 1773ء، دور حکومت) کا لقب تھا

جسے ان کے پیرومرشد سید صابر شاہ نے دیا تھا مگر بہت سارے پشتون قبائل اپنے قبیلے کی بجائے درانی کہلاتے ہیں یہ صرف اپنی برتری ثابت کرنے اور دوسروں سے امتیازی نظر آنے والی یا حد سے زیادہ خوش فہمی میں مبتلا رہنے والی بات ہے۔118

عرب کون ہیں؟ ان کی نسلی اصلیت کیا ہے؟ ان کا آغاز کب ہوا؟ اور ان کی سیاسی تاریخ کیسے گذری؟ ان باتوں کا مختصرا جائزہ ذیل میں لیا جارہا ہے تا کہ ان کا بھی حسب نسب سامنے آئے جنکے ساتھ اکثر و بیشتر بلوچوں کا نسلی تعلق جوڑا جاتا ہے جبکہ حقیقتاً عربوں کے ظہور میں آنے سے بھی پہلے بلوچ اپنے خطے میں موجود تھے۔اس پر آگے بحث ہوگی پہلے عربوں کی تاریخ کا مختصر جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

عرب مؤرخین نے اہل عرب کو ابتدا میں دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا ہے جو العرب البائدہ اور العرب الباقیہ کے نام سے موسوم ہیں۔119 بعدازاں عرب البائدہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے فنا ہو گئے کیونکہ ان میں گناہ، شرک، بت پرستی اور خدا کے وجود سے انکار اس حد تک سرایت کر گئی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر سخت عذاب نازل کر کے انھیں سخت ترین سزا دی کہ اس دنیا سے ان کی نسلوں کا وجود ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم ہو کر رہ گیا ان اقوام میں عاد، ثمود، طسم، جدیس اور جرہم الاولیٰ شامل تھے عربوں کی دوسری قسم جو العرب الباقیہ کہلاتا ہے اسکی دو شاخیں ہیں یعنی العرب العاربہ اور العرب المستعربہ۔ العرب العاربہ کی مشہور شاخ قحطان ہے ان کا وطن یمن تھا اور ان کے دو مشہور قبیلے جرہم اور یعرب ہیں یعرب کی اولاد میں سے کہلان اور حمیر میں بے شمار قبائل اور خاندان معرض وجود میں آئے۔حمیر سے قضاعہ نے جنم لیا اور قضاعہ کے مشہور قبائل بلیٰ جہنیہ، کلب بہرہ، بنو ہند اور جرام تھے۔کہلان کی اولاد سے ازد جو اوس خزرج اور جعنہ کے جد اعلیٰ تھے جعنہ کی اولاد شام کے غسانی حکمران تھے ازد کے علاوہ طے، مزحج اور بنو ہمدان بھی کہلان کی نسل سے تھے۔یمن کے عربوں نے بڑی ترقی کی اور عظیم الشان سلطنتیں قائم کیں یعنی معین، سبا، حمیر، پھر بمرور زمانہ انکی سلطنتیں جب گردش زمانہ کی نذر ہو گئیں تو انھوں نے مکہ، یثرب، صحرا سماوہ، شام، عمان اور موجودہ عرب علاقوں میں سکونت اختیار کر لی۔120

عرب الباقیہ کی دوسری شاخ کو العرب المستعربہ یا المتعربہ کہا جاتا ہے کیونکہ ان کے جد اعلیٰ کی مادری زبان عربی نہیں تھی حضرت اسماعیلؑ کی زبان عبرانی یا سریانی تھی۔121 حضرت اسماعیلؑ

کی شادی مکہ پر قابض ہونے والی عرب العاربہ کی قحطانی شاخ کے قبیلہ بنو جرہم کی ایک خاتون کے ساتھ ہوئی تھی۔اسی قبیلے کی وجہ سے آپؑ اور آپؑ کی اولاد عربی زبان سے آشنا ہوئے اور اسی وجہ سے یہ عرب مستعربہ کہلاتے ہیں۔اس وقت بھی حدود حجاز سے لیکر شام کے صحرا تک آباد عرب قبائل کی بڑی اکثریت عرب مستعربہ میں سے ہیں۔122

حضرت اسماعیلؑ کی اولاد بارہ بتائی جاتی ہے جنکی تفصیل یہ ہے (1) نیاوذ (نبت، نابت)، (2) قیذر، (3) اذبل، (4) منسی (مشی)، (5) مسمع (مستماعہ)، (6) دماء (دوما، دومتہ الجندل انہی کے نام سے منسوب ہے)، (7) مالشی (8) اذر، (9) طیما (10) قیطور، (11) نیش، (12) قیذ ما۔123 حضرت اسماعیلؑ کی 40ویں پشت میں عدنان کا ذکر آتا ہے تمام مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت اسماعیلؑ کی اولاد عدنان سے پھیلی جس کے دو بیٹے تھے (1) لمک، (2) معد۔ان میں بعدازاں معد کی اولاد کو برتری حاصل ہوئی حکومت اور سیاست میں یہ خاندان اعلیٰ و ارفع مقام پر رہا معد کے دو بیٹے قنص اور نزار تھے قنص کی اولاد مکہ کے پہاڑوں اور گھاٹیوں پر قابض رہا لیکن نزار کی اولاد کی پانچ شاخیں قضاعہ مضر، ربیعہ، ایاد اور انمار تھے۔بنو قضاعہ نے بحیرہ احمر کے ساحل جدہ سے لیکر مشرق میں عراق کے سرحدوں تک قبضہ کر لیا تھا۔مضری قبائل حرم مکہ اور سروات کے اردگرد کے علاقوں پر قابض ہو گئے ربیعہ نمر ذی کندہ کے پہاڑی سے عراق کی سرحدوں کے ساتھ ساتھ نجد تک پھیل گئے ایاد اور انمار مصر اور نجد کے درمیانی علاقوں پر قابض ہو گئے۔124

بعدازاں معد کی اولاد میں آپس میں خانہ جنگی ہوئی ان میں سے بہت سارے قبائل جزیرہ کوفہ، فرات اور موصل پر قابض ہوئے اور باقیماندہ روم کیطرف چلے گئے حتیٰ کہ اسلام کی آمد تک یہ قبائل انہی علاقوں میں آباد رہے۔125 حضرت اسماعیلؑ سے قبل اور بعد کے حالات بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ یہ دیکھا جائے کہ بلوچ قبائل کا تعلق ان کی کس اولاد سے بنتا ہے اور یہ بات واضح ہوئی کہ ان کی اولادیں سب سرزمین عرب اور اس کے آس پاس آباد رہیں۔ان پر جتنی بھی افتاد نازل ہوئیں تو بھی انھوں نے حتیٰ الوسع یہی کوشش کی کہ اپنا آبائی وطن نہ چھوڑیں اور اگر بحالت مجبوری انھوں نے اپنا وطن چھوڑ بھی دیا تو زیادہ تر نے خوشحال اور آباد ممالک یعنی مصر اور روم کا رخ کیا جہاں زراعت اور تجارت دونوں شعبوں میں ترقی کے امکانات زیادہ روشن تھے۔ان میں سے

اسلام کی آمد تک کسی قبیلے کا وہاں سے اٹھ کر مشرق کی طرف ہجرت کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔

جس طرح پچھلے اوراق میں ذکر ہوا کہ رندوں کی حلب سے سیستان آمد ایک افسانے کے سوا کچھ نہیں لہٰذا بعد از اسلام بھی بلوچ کہیں باہر سے اٹھ کر یہاں وارد نہیں ہوئے عربوں کا انساب پچھلے اوراق میں مع مختصر تاریخی تعارف کے پیش ہو چکا ہے۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ آل اسماعیلؑ میں سے کوئی بھی شخص ان کا مورث اعلیٰ یا جدامجد نہیں ہے۔

لہٰذا خاندانی، قبائلی یا فوجی برتری حاصل کرنیکی خاطر اپنی تاریخ مسخ کرنا مناسب نہیں ہے اور آل اسماعیلؑ سے اپنا رشتہ بغیر کسی تاریخی ثبوت اور سائنسی تحقیق کے جوڑنا قطعی نامناسب سی بات ہے۔

اس کے علاوہ بلوچ طبعاً سپاہی رہا ہے جبکہ عربوں میں سپاہیانہ خصلتیں گوکہ بہت پرانی تھیں مگر بیرونی دنیا پر بہت بعد میں یعنی اسلام کی آمد کے بعد انھوں نے اپنی دھاک بٹھادی اس سے قبل ان کا پیشہ زیادہ تر مال مویشی پالنا، زراعت سے وابستہ ہونا یا پھر تجارت کرنا تھا جب معین، سبا، حمیر، حیرہ اور بنو غسان وغیرہ کی سلطنتیں اور ریاستیں وجود میں آئیں گوکہ وہ ایران اور روم کے زیر اثر تھے لیکن ان کی تجارت عروج پر تھی ان کے تجارتی کارواں خشکی کے راستے مصر، بابل، میڈیا، لیڈیا، باختر یا، چین، ہندوستان، سراندیپ اور دور دراز کے علاقوں تک سفر کرتے تھے چین، ہندوستان، مالا بار اور سراندیپ تک بحری راستے سے بھی تجارت ہوتی تھی اس مقصد کیلئے وہ ہمیشہ خلیج فارس اور ساحل مکران کو استعمال کرتے تھے یہیں سے ان کے تعلقات بلوچستان کے ساحلوں پر بسنے والے آزاد قبائل کے ساتھ قائم ہو گئے۔ ہوسکتا ہے کہ عربوں نے ساحل مکران یا اندورن مکران نو آبادیات یا تجارتی کوٹھیاں قائم کی ہوں اور ان کی معمولی سی تعداد نے یہاں سکونت بھی اختیار کی ہو اور ہوسکتا ہے ان کی اس تعداد نے یہاں رشتہ داریاں بھی کی ہوں اول تو تاریخ اس بارے میں بالکل خاموش ہے اور دوئم یہ کہ اگر انھوں نے رشتہ داریاں کی بھی ہوں تو وہ بلوچوں میں کچھ ایسے مدغم ہو گئے ہیں کہ اب انہیں ڈھونڈ نکالنا ممکن نہیں۔

مولانا نور احمد فریدی بھی اسی نظریہ فکر کے حامی ہیں لہٰذا ان کے نظریہ کی مزید وضاحت کرنا اور اس پر روشنی ڈالنا ضروری نہیں ہے۔ آغا نصیر خان احمد زئی کمبرانی بلوچوں کو کرد ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور لفظ بلوچ کے معنی کردوں کے امتیازی فوجی نشان مرغے کی کلغی سے لکھیے

دیتے ہیں۔ 126 مگر یہ نظریہ باطل اور غلط ہے کیونکہ اگر اس نشان کی وجہ سے لفظ بلوچ وجود میں آیا ہے تو پھر کرد کا نام کرد کیوں باقی رہا اصل میں تو کرد کے نام کو بلوچ ہونا چاہیے مگر دونوں مختلف ناموں سے الگ الگ وجود رکھتے ہیں دراصل کرد بذات خود بلوچوں کا ایک بڑا قبیلہ ہے جو ماضی قدیم میں بھی ایک کثیر جماعت رکھنے کی وجہ سے الگ قومی اور قبائلی نام سے مشہور ہوا اور اکثر کتب تاریخ میں اسے قومی کی بجائے زیادہ تر اس کے قبائلی نام کرد یا کیرد سے لکھا اور جانا جاتا ہے کرد بلوچ ہیں نہ کہ بلوچ کرد ہیں۔

دور جدید میں بھی کردوں کی کثیر جمیعت دنیا کے مختلف ممالک خصوصاً روس، ایران، ترکی، شام، فلسطین اور اسرائیل سمیت بلوچستان اور افغانستان میں بھی آباد ہیں بلوچستان میں جو کرد آباد ہیں وہ نہ صرف بلوچ کہلاتے ہیں بلکہ بلوچ قومی وطنی سیاست میں ان کا ایک اعلیٰ وارفع کردار رہا ہے البتہ جو کرد دیگر ممالک بشمول مشرق وسطیٰ وغیرہ میں آباد ہیں، وہ الگ قومی نام کرد سے پہچانے جاتے ہیں۔

جسٹس میر خدا بخش بجارانی مری بھی بابلی نظریے کے حامی ہیں وہ لکھتے ہیں کہ:

"وہ (بلوچ) شام کی عظیم سامی نسل کی ایک شاخ ہے وہ شمالی شام میں رہتے تھے پھر وہاں سے غالبًا جنوب میں قدیم بابل کی جانب روانہ ہوئے اور وہاں تاریخ عالم کی ایک عظیم مملکت (بابل) کا قیام عمل میں آیا"۔ 127

بابلی سلطنت کے قیام اور اس پر حکومت کرنے والے مختلف اقوام اور خاندانوں کے عروج و زوال پر پچھلے صفحات میں تفصیلی بحث ہو چکی ہے اور ہر دور اور ہر خاندان پر الگ الگ روشنی ڈالی گئی ہے اس موضوع پر مزید بحث کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی مختصراً یہی لکھ دینا کافی ہوگا کہ اس نظریے کی بنیاد بھی دراصل پروفیسر راؤلنسن کا کلدانی النسل نظریہ ہے۔

مولانا نور احمد فریدی کا یہ بیان کہ عمالقہ نے بنو اسماعیل کو مکہ سے نکالا تو انھوں نے وادی البلوص میں آکر پناہ لی اور یہاں سے نکل کر جب ایران پہنچے تو بلوص سے بلوچ بنے۔ 128 اس بیان میں مولانا صاحب بلوچوں کی قومیت کو ان کی شہریت میں تبدیل کر رہے ہیں یعنی وادی البلوص کیوجہ سے یہ لوگ بلوص یا بلوچ کہلائے اگر وادی البلوص کی وجہ سے ان کی قومیت مشہور ہوتی تو یہ بلوص یا بلوچ کی بجائے بلوصی یا بلوچی کہلاتے مولانا فریدی کا نظریہ بھی بے بنیاد ہے

اورتاریخی طور پر اسکی کوئی تصدیق نہیں ہوتی۔

بنوجرہم (آل اسماعیلؑ) کو بنوخزاعہ نے مکہ سے نکالا تھا عمالقہ عرب عملیق کے باشندے تھے۔129 بنوخزاعہ انہی کی ایک شاخ تھی۔ بنوجرہم عرب سے نکالا نہیں گیا بلکہ اسے صرف مکہ سے نکالا گیا تھا۔ بعد میں عرب کے اندران کی زبردست حکومتیں قائم ہوگئیں جنکی تفصیلات پہلے بیان ہو چکی ہیں مولانا فریدی کو صرف اتنا ہی بتانا مقصود ہے کہ بنواسماعیلؑ نے کبھی بلوچستان کا رخ نہیں کیا بلکہ پوراعرب مستعربہ (آل اسماعیلؑ) جسطرح پچھلے اوراق میں تذکرہ ہوا کہ عرب سرزمین میں آباد رہا حتیٰ کہ عرب عاربہ یعنی قحطانی عرب بھی انہی میں ضم ہوگئے ان کے کچھ قبائل روم اور مصر کی طرف نکل گئے اور زراعت وتجارت میں مشغول ہوگئے اور آج بھی عرب سرزمین کے باشندوں کی غالب اکثریت عرب مستعربہ سے ہی تعلق رکھتے ہیں بلوچوں کا ان سے کوئی نسلی رشتہ نہیں بنتا البتہ اسلام کے بعد بلوچستان سمیت ایشیاء کے ایک بڑے حصے پر تقریباً4 سوسال تک ان عربوں کی حکومت رہی۔

ڈاکٹر میر عالم خان راقب سے بھی اتفاق نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ بھی مشرق وسطیٰ کے بابلی نظریے کا حامی ہے لکھتا ہے کہ "(بلوچ) بلوص بن کاؤس شاہ بابل کی اولاد ہیں۔ 130 وہ مری قبیلے کا شجرہ نسب ہندوستان کے موریا خاندان سے ملاتا ہے مگر وہ یہ بھول جاتا ہے کہ مری رند بلوچ ہیں۔"

محمد حسین عنقا صاحب نے بلوچوں کا جائزہ لیتے ہوئے درج ذیل رائے پیش کی ہے۔

"اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دنیا کی کوئی قوم خالص نہیں ہے مختلف حالات کے تحت صد والے افراد، خاندان اور قبائل رفتہ رفتہ ایک ہی ثقافت کے تابع ہو جاتے ہیں اور اسی نام کو قبول کر لیتے ہیں جو اسی علاقے کا نام پہلے پڑ چکا ہوتا ہے اس لئے یہ دعویٰ کرنا صحیح نہ ہوگا کہ آج جتنے خاندان یا قبائل بلوچ کہلاتے ہیں وہ سب کے سب واقعی بلوچ نسل سے ہیں سندھ میں جس طرح مختلف قبائل واقوام آباد ہیں اور سندھی کہلاتے ہیں اسی طرح بلوچستان میں آباد اور اسکے نیک وبد سے متاثر ہونے والے بلوچ کہلاتے ہیں۔131

عنقاء صاحب کا نظریہ نہیں ہے بلکہ بلوچوں کا ایک سطحی جائزہ ہے اس میں کئی باتوں پر اعتراض کیا جا سکتا ہے مثلاً سندھ کے قبائل واقوام سندھی اور بلوچستان کے قبائل اور اقوام بلوچ

کہلاتے ہیں۔ مذکورہ مصنف کی یہ بات تاریخی حقائق سے ناواقفیت کا ثبوت ہے کیونکہ سندھ میں رہنے والے تو بے شک لفظ سندھ سے سندھی بنے ہیں یا باالفاظ دیگر سندھی ان سب اقوام کی شہریت ہے قومیت نہیں مگر بلوچستان نے لفظ بلوچستان ہی بلوچ قوم سے پایا نہ کہ بلوچ نے لفظ بلوچ، بلوچستان سے پایا اگر بلوچ کو یہ نام بلوچستان کی وجہ سے ملتا تو پھر اسے بلوچ کی بجائے بلوچستانی ہونا چاہئے تھا نہ کہ بلوچ۔ بلوچ قومیتی نام ہے جبکہ بلوچستانی شہریتی نام جیسے پنجابی، بنگالی، امروہوی، دھلوی، چینی، ہندوستانی وغیرہ۔ یہ صرف شہریتی نام ہیں یعنی جس شہر، علاقے یا ملک سے تعلق رکھتے ہیں انہی کا سابقہ نام کے آگے لکھا جاتا ہے یہی مثال بلوچستانی کے لفظ پر بھی صادق آتی ہے۔

اس کے علاوہ سندھ کے بلوچ اگرچہ اپنے آپ کو سندھی کہتے ہیں تو بھی یہ ان کا شہریتی نام ہے قومیت کے حوالے سے پوچھنے پر یا تو اپنے قبیلے کا نام لیتے ہیں یا پھر اپنی قومیت بلوچ/بروہی کہتے ہیں۔ البتہ یہ درست ہے کہ بلوچ جہاں پر بھی رہے اور جس گھاٹ کا پانی پیا اپنی تمامتر وفاداری اور مفادات اس خطے اور وہاں کے رہنے والے لوگوں سے وابستہ کیں اور جانیں تک قربان کیں جسکی تاریخ میں بے شمار مثالیں موجود ہیں لیکن اپنی قومیت کبھی تبدیل نہیں کی بلکہ اس چیز کو بلوچی میں (میار) یعنی انتہائی حقیر اور ذلت آمیز کام سمجھا جاتا ہے۔

مندرجہ بالا اوراق میں کئی نسلی اصلیت اور اصل ماخذ کے حوالے سے مختلف مؤرخین کی آراء کا جائزہ لیا گیا۔ ہر مورخ نے اپنے اپنے دلائل کے ساتھ بلوچوں کا نسلی تعلق نسلوں کے مختلف گروہوں اور شاخوں سے ملانے کی کوشش کی ہے مگر یہ سارا کام تحقیقی بنیاد پر نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مورخ اپنے بیان کئے ہوئے نظریہ پر بھی مکمل طور پر متفق نہیں ہے۔ اکثر وبیشتر مؤرخین بلوچ اداروں، معاشرتی زندگی، رسوم وروایات اور اقدار واصول کو نظر انداز کئے بغیر ان کا تعلق دوسری نسلوں یا اقوام کے ساتھ جوڑتے ہیں کوئی انھیں آرین خانہ بدوش لکھتا ہے تو کوئی عرب صحرانورد حتیٰ کی تاجک، ہندوستانی، راجپوت اور ترکمان تک کے نسلی تعلق کے نظریے بیان کئے گئے ہیں یہاں ایک سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا ان حضرات نے بلوچ وطن کو بذات خود گھوم پھر کر دیکھا ہے؟ اور کیا وہ بلوچ کچاری (Gathering) میں کبھی بیٹھے ہیں؟ اور اس کے علاوہ انھوں نے حقیقی بلوچ زندگی کا مطالعہ کیا ہے؟ تو اسکا جواب یقیناً نفی میں ہوگا۔

یہ تمام تاریخی مواد جو خصوصاً برطانیہ کے اہلکاروں اور بلوچ حلقہ احباب نے تحریر کی ہیں صرف لائبریری ورک ہے ہر ایک مصنف نے بلوچوں کی کسی ایک عادت یا ادارے کو دیکھ کر اسے کسی دوسری قوم کے مذکورہ عادت یا ادارے کے مماثل سمجھ کر بلوچوں کو اسی قوم یا نسل کا حصہ قرار دیا اور افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہر مورخ ان کا رشتہ تو اعلیٰ نسلوں کے ساتھ ملاتا ہے مگر انھیں بہر حال اس خطے میں مہاجر قرار دیتا ہے کسی نے اس مٹی کے ساتھ جڑے ہوئے اس کے رشتوں پر کبھی غور نہیں کیا کسی مورخ، ماہر کو یہ توفیق عطا نہیں ہوئی کہ وہ بلوچستان کے طول وعرض میں پائے جانے والے آثار قدیمہ کے ساتھ بھی بلوچ اور ان کے معاشرتی زندگی کا موازنہ کرے، ہوسکتا ہے بلوچوں کی گمشدہ کڑیاں یہیں پر دستیاب ہوں۔

غیر ملکی مؤرخین نے کس نیت سے بلوچوں کی تاریخ رقم کی اور بلوچ مؤرخین نے کونسا مواد سامنے رکھ کر اپنے قوم کی تاریخ رقم کی اس بحث سے اب قطع نظر تاریخ کے جھروکوں میں بلوچوں کی تاریخ تلاش کی جائیگی۔ برطانوی مواد کے اغراض ومقاصد سیاسی اور فوجی تھے وہ اپنے سامراجی عزائم کی تکمیل کر رہے تھے اس لئے انھوں نے یا تو بلوچ قبائل اور سرداروں کو خوش کرنے کیلئے ان کی تاریخ لکھی یا پھر انھیں دیگر محاذوں سے بے خبر اور لاتعلق کرنے کی خاطر یہ تاریخی جرم کیا۔ وگرنہ ان جاسوسوں، فوجی افسروں اور دیگر اہلکاروں کا بلوچستان کے حالات لکھنے کا مقصد برطانوی حکومت کو اصل پوزیشن سے آگاہ کرنا تھا۔ اب انھیں بلوچ قوم سے کسی بڑی مزاحمت کی امید بھی نہیں تھی کیونکہ 1839ء کے بعد انھوں نے بلوچوں کو مزید 21 سالوں تک خانہ جنگی میں مصروف رکھا اور اس دوران ان کی تاریخ بھی رقم کرتے رہے برطانوی مواد قابل بھرسہ اور قابل اعتماد نہیں ہے البتہ انگریزوں سے قبل لکھی جانیوالی دستاویزات تاریخی لحاظ سے بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ اس مواد سے اولاً انگریزوں کے قائم کردہ نظریات کی مکمل نفی ہوتی ہے اور ثانیاً یہ مواد بلوچوں کے حسب نسب سیاسی وقومی تاریخ کے علاوہ ان کی قدامت پر بھی واضع روشنی ڈالتی ہے۔ انگریزوں سے قبل کا یہ مواد زیادہ تر فارسی اور عربی میں ہے البتہ یونانی مورخ ہیروڈوٹس، ایرین اور سٹریبو بھی اس لحاظ سے اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ ان قدیم مؤرخین نے بھی جنکا تعلق یونان (یورپ) سے تھا۔ بلوچوں کے بارے میں گرانقدر معلومات فراہم کی ہیں۔ سابقہ بلوچ مؤرخین کا یقیناً اس عرب فارسی اور یونانی مواد سے واسطہ نہیں پڑا ہوگا جن میں بلوچوں کی اصلیت، اصل جغرافیہ،

ایران کی تاریخ میں ان کا سیاسی وفوجی کردار وعمل اور ان کی قدامت واضع اور صاف الفاظ میں بیان کی گئی ہیں۔ ان بیانات کے مطالعہ سے آسانی کے ساتھ بلوچوں کی قدامت اور اصل مساکن کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

دوسرا ذریعہ بلوچ اصلیت کی تلاش کا یہ ہے کہ ان آثار قدیمہ اور قدیم ٹیلوں کا تحقیقی جائزہ لیا جائے اور ان سے برآمد ہونے والی اشیاء اور ان لوگوں کے طرز معاشرت کی بنیاد پر تحقیقی کام کر کے ان کی اصلیت کو آشکارا کیا جائے۔ قیاس یہی کہتا ہے کہ یہ ٹیلے اصل میں بلوچوں کے ابتدائی گھر اور مساکن تھے کیونکہ اب تک برآمد ہونے والی اکثر وبیشتر اشیاء آج کے اس جدید دور میں بھی بلوچ گھروں میں انہی مقاصد کیلئے استعمال ہوتے ہیں جن مقاصد کیلئے ہزاروں سال پہلے ہوتے تھے۔ ان ٹیلوں سے برآمد ہونے والی اکثر وبیشتر اشیاء بلوچ معاشرے کی روزمرہ استعمال کی اشیاء سے کافی حد تک مماثلت رکھتی ہیں۔

ان دونوں ذرائع کو بروئے کار لاتے ہوئے بلوچوں کی اصلیت ان کی قدامت اور تاریخی کردار وعمل کا جائزہ لیا جائیگا تاکہ کسی نتیجے پر پہنچا جاسکے اس سلسلے میں پہلے تحریری تاریخ کے ذریعے بلوچ اصلیت اور قدامت پر بحث ہوگی۔

وہ سوالات جو شروع کے اوراق میں کئے گئے یعنی بلوچ کون ہیں؟ بلوچوں کی قدامت کتنی ہے؟ کیا بلوچوں نے تاریخ میں کوئی مقام پیدا کیا؟ بلوچوں کا اصل جغرافیائی محل وقوع کیا ہے؟ لفظ بلوچ کے کیا معنی ہیں؟ بلوچوں کی نسلی اصلیت کی تلاش کیلئے کون سے مستند ذرائع تحریری شکل میں موجود ہیں؟

درج بالا سوالوں کا جواب یقیناً ایسے مستند اور قدیم تحریری ذرائع ہونے چاہیے جو اس وسیع موضوع پر جامع معلومات فراہم کرسکیں۔ دراصل بلوچستان زمانہ قدیم سے جبکہ تحریری علم بھی وجود میں نہیں آیا تھا لوگوں کی ایک اہم ترین گزگاہ رہی ہے۔ زمانہ ماقبل تاریخ کے غیر تحریری اسناد بلوچستان کے ٹیلوں اور دیگر آثار قدیمہ کے مقامات سے بے شمار تعداد میں برآمد ہوئے ہیں جن کا تعلق بلوچستانی تہذیب سے نہیں رہا اور اسی طرح دنیا کے بیشتر مقامات سے ایسی اشیاء برآمد ہوئی ہیں جن کا تعلق بلوچستان کی صنعت سے رہا ہے۔ زمانہ ماقبل تاریخ میں یہاں سے گذرنے والی اقوام کی تحریری تاریخ موجود نہیں ہے مگر ماہرین تاریخ، تاریخی دور کا آغاز آرین حملوں سے کرتے

ہیں اگر آرین حملوں (1500ق م) سے اس خطے اور یہاں پر رہنے والے لوگوں کا تذکرہ کیا جائے تو وہ بلا شبہ بلوچ تھے۔ مگر اتنے بڑے تاریخی موضوع پر بات کرنے کیلئے صرف زبانی روایات یا غیر مستند شاعری ہی بنیاد نہیں ہوسکتی اس کیلئے تحریری تاریخ (حقیقی تاریخ) کا ہونا بہت ضروری ہے۔

انگریزوں سے قبل بھی یہاں کی تاریخ پر بہت کچھ لکھا گیا یہ الگ بات ہے کہ انھیں اس طرح منظر عام پر نہیں لایا گیا جسطرح برطانوی مواد کو اہمیت دی گئی حالانکہ پہلی بار بلوچوں پر تحریری مواد 480ق م کے لگ بھگ تاریخی کتب میں موجود ہے۔ بعد ازاں عربوں کے ابتدائی دور اور خصوصاً عباسی دور کے زمانہ عروج میں بڑے بڑے علماء تاریخ نے دنیا کی مختلف اقوام اور ممالک کے تواریخ اور جغرافیہ ترتیب دیے۔ ان کا مقصد بھی توسیع پسندانہ تھا اور عزائم سامراجی تھے مگر انھوں نے آنے والے ان مؤرخین کو جو اقوام کی تاریخ پر تحقیق کرنے کے خواہشمند ہیں ایک ایسا خزانہ عطا کیا کہ جو سونے چاندی کے انباروں سے بھی زیادہ قیمتی ہیں۔ ان مؤرخین میں بابائے تاریخ ہیروڈوٹس (Herodotus) ایرین (Arian) سٹریبو (Strebo) کا تعلق قدیم یونان سے ہے جبکہ بابائے مسلم تاریخ نویسی اور بابائے عمرانیات ابن خلدون، ابن حوقل، المقدسی، ناصر خسرو، ابو عبداللہ یاقوت، ابن خردادبہ، اصطخری، قزوینی، محمد بن جریر طبری، ابوالقاسم فردوسی، ملک الشعراء بہار، علامہ شبلی نعمانی اور تواریکینہ قاضی وغیرہ عرب ایران وغیرہ سے ہیں اور انھوں نے بلوچوں کے قومی وجود اور نسلی ولسانی جغرافیہ کے بارے میں ایسے گرانقدر معلومات فراہم کی ہیں جو بلوچوں کی قدامت، اصلیت، اور سیاسی وفوجی کردار و عمل کی مکمل نقشہ کشی کرتے ہیں۔

مندرجہ بالا علماء کے جید اور مستند ہونے میں کوئی شک نہیں ہے ان کا نام ہی تحریر کیلئے سند مانی جاتی ہے ان مؤرخین میں سے ہر ایک نے قدیم بلوچوں کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھا ہے کسی نے کم تو کسی نے زیادہ۔ ان میں سے ہر لکھنے والے نے انھیں ایران کے مشرق، جنوب مشرق اور شمالی کے علاوہ مکران، جنوبی افغانستان، اور وسطی بلوچستان میں آباد ظاہر کیا ہے۔ اس طرح ان کی اصلیت کے علاوہ انکے اصل جغرافیہ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

مستند ہونے کے لحاظ سے ان قدیم نسخوں کو کوئی چیلنج نہیں کرسکتا اور ہر ایک نے بلوچ قوم اور مساکن کے بارے میں گرانقدر معلومات فراہم کیے ہیں۔ مگر شاہنامہ فردوسی اس لحاظ سے اہم

ترین دستاویز ہے جس میں بلوچوں کے بارے میں سینکڑوں اشعار اور مختلف واقعات کے علاوہ ان کا جغرافیہ بھی انتہائی تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

بلوچ اور بلوچستان کے موضوع پر لکھنے والے اکثر مؤرخین نے اس اہم ترین دستاویز سے استفادہ کیا ہے مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ تقریباً ہر مورخ نے ان اشعار کی تشریحات اور توجیہات کو منفی انداز میں سمجھا اور بیان کیا۔ کسی نے ان اشعار کو ان گہری نظروں سے نہیں دیکھا کہ جس سے فردوسی کا اعتراف مرعوبیت سامنے آتا ہے کیونکہ اگر ایک جگہ فردوسی بلوچوں کے حملوں کو ڈاکہ زنی اور مارا ماری سے تعبیر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

ز بس غارت وکشتن و تاختن

تو دوسری جگہ ان کی بہادری، دلیری اور وفاداری کے ساتھ ساتھ ان کے فوجی کارناموں سے وہ مرعوب ہوتا نظر آتا ہے۔ اور خود اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کہ

گزین کرد از نامداران سوار — دلیران جنگی دہ و دو ہزار

ہمی پہلی پارس کوچ و بلوچ — زگیلان جنگی و دشت سروچ

بلوچوں کی بھاری جمیعت اور ایران، مشرق وسطیٰ اور وسطی ایشیاء کی سیاست میں ان کی اہمیت سے فردوسی جیسا سیاسی شاعر بھلا کیسے انکار کرسکتا ہے لہٰذا نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ان کے کردار کا اعتراف کرنا پڑا اور پھر اس نے فرہنگ الفاظ سے ایک ایسا ذخیرہ جمع کیا جو مستقبل کے بلوچ قوم اور بلوچ مورخ کیلئے سب سے زیادہ کھلا اور روشن دریچہ بن گیا۔ فردوسی کے علاوہ دیگر مؤرخین جغرافیہ دان اور سیاحوں نے اپنی بساط کے مطابق بلوچوں کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلومات فراہم کی ہیں مگر ابوالقاسم فردوسی اس لحاظ سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں جنھوں نے بلوچوں کی قوت کا ایک ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ پڑھنے والا حیران و ششدر رہ جاتا ہے اور جب وہ یہ لکھتا ہے کہ نوشیروان اعظم بذات خود ایک عظیم و جرار لشکر لیکر ان کی سرکوبی کو نکلا اور بالآخر انھیں شکست فاش دی تو صرف اسی ایک واقعے سے ہی بلوچوں کی عظیم جمیعت اور عظیم الشان قوت ہونے کا یقین ہو جاتا ہے۔ پچھلے صفحات میں شاہنامہ فردوسی میں درج ان ابواب کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا جو خصوصاً بلوچوں اور ان کے کردار و عمل کے بارے میں ہیں۔ گو کہ ان میں دیگر اقوام کا بھی تذکرہ موجود ہے لیکن مرکزی کردار بلوچوں کا ہے اور اس تمام تر کہانی اور واقعات کا اصل محور بلوچ

ہی ہیں۔

زمانہ قدیم سے لیکر آج تک ایران اور ایرانی سیاست میں بلوچوں کے عظیم کردار سے کوئی بھی مورخ یا تاریخ سے واقف شخص انکار نہیں کرسکتا کیونکہ فردوسی جو ایک بڑے دربار کا شاعر تھا ،بھی بلوچوں کے سیاسی وفوجی کردار اور اسکی اہمیت کا معترف ہے۔ گوکہ فردوسی ان سے خوش نہیں لیکن مملکتوں کے سیاسی اتار چڑھاؤ میں ان کے کردار سے بخوبی آگاہ ہے اور ان کے اس مرکزی کردار کا جگہ جگہ ذکر بھی کرتا ہے۔ فردوسی کبھی ان کو ایرانی حکومتوں کی جانب سے بطور ہراول دستے کے وسط ایشیاء میں لڑتا ہوا بتاتا ہے اور کبھی موجودہ بلوچستان کے مشہور پہاڑ چلتن کے دامن میں۔ اسی طرح بقول فردوسی کا کبھی وہ سفید ہنوں کے خلاف لڑ رہے ہیں اور کبھی رومیوں سے نبرد آزما ہیں۔

اس تمام توصیف وثنا کے باوجود فردوسی انھیں ایرانی حکومت کا باغی لکھتا ہے اور پھر نوشیروان کو ان کے خلاف لشکر کشی کرتے ہوئے ان کے قتل عام کا ذکر کرتا ہے۔ فردوسی ایرانی حکومت کیلئے ان کی تمام تر خدمات کو بالائے طاق رکھ کر ان سے اس وجہ سے نفرت کا اظہار کرتا ہے کیونکہ قباذ اور اس سے قبل فیروز کے دور میں بلوچوں کے ساسانی حکمرانوں سے تعلقات کشیدہ رہے تھے اور پھر فیروز ،قباذ اور نوشیروان کے عہد تک ان کی عظیم جدوجہد جاری رہی تھی۔ گوکہ ان جنگوں اور اس جدوجہد کا تذکرہ پچھلے صفحات میں ہو چکا ہے ممکن ہے ضرورت پڑنے پر اگلے اوراق میں ان واقعات یا ان میں سے کسی واقعے کا دوبارہ تذکرہ کیا جائے۔

فردوسی نے آخر کیوں بلوچوں کا ذکر اپنی مشہور زمانہ کتاب شاہنامہ فردوسی میں کیا ہے اور وہ بھی اتنی تفصیل کے ساتھ۔ اسکی کوئی بھی توجیہہ بیان کی جائے لیکن میری تحقیق کے مطابق اسکی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ بلوچوں کی ایک بہت بڑی اکثریت نے فاتح سومنات کے بلوچستان پر جابرانہ قبضہ کو قبول نہیں کیا اور انھوں نے جھالاوان کے پہاڑوں سے لیکر ایران میں دشت لوط تک محمود غزنوی کیلئے محاذ جنگ کھولا اور محمود غزنوی اپنے 34 سالہ دور اقتدار میں اس جنگ پر قابو نہیں پاسکا کیونکہ یہ کھلے میدان میں لڑی جانے والی جنگ نہیں تھی کہ جس میں محمود غزنوی اپنے گھڑ سوار اور نیزہ بردار افواج کے ساتھ نہتے بلوچوں کو چھید کر ان کے لاشوں کے انبار لگاتا بلکہ یہ ایک چھاپہ مار اور مسلسل جنگ تھی کبھی ایک چوکی پر حملہ اور کبھی دوسری چوکی پر، کبھی ایک قافلے کو لوٹا تو کبھی

دوسرے کارواں کو۔ اس طرح بلوچوں نے محمود غزنوی کو جنگ کے ایک ایسے دلدل میں پھنسایا کہ جس سے نکلنا اسے مشکل لگ رہا تھا گوکہ بلوچوں کی ایک کثیر تعداد ان کی فوج میں شامل تھی۔ مگر اس کے باوجود ان قبائل نے بلوچ خطے پر محمود غزنوی کی زبردستی اور بزور طاقت قبضے کو قبول کرنے سے انکار کیا اور اسکے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ مقدمہ ابن خلدون، تاریخ بلوچستان از ملک محمد سعید دھوار، تاریخ سیستان از ملک الشعراء بہار وغیرہ میں ان واقعات اور جنگوں کی تفصیلات موجود ہیں۔ لہٰذا بحیثیت درباری شاعر اور مشیر خاص کے ابوالقاسم فردوسی نے منظوم انداز میں محمود غزنوی کو بلوچوں کے ماضی کی پوری داستان گوش گزار کردی کہ جس طرح آج یہ قوم آپ سے بغاوت پر تلی ہوئی ہے بالکل اسی طرح ماضی قدیم میں آپ کے آباؤ اجداد کے ساتھ بھی اس قوم کا یہی رویہ رہا ہے اور انھیں طاقت کے بل بوتے پر دبایا نہیں جاسکتا ان کو زیر کرنے کیلئے طاقت کیساتھ ساتھ حیلہ اور مکاری بھی ضروری ہے (تاریخ نے فردوسی کی اس قول کو بار بار سچ کر دکھایا ہے)۔ بہرحال کچھ بھی ہو فردوسی کے اس احسان کو کبھی بھلایا نہیں جاسکتا کہ انھوں نے بلوچوں کے وجود اور ان کے جغرافیہ کے بارے میں آنے والے مؤرخین کو آگاہ کر کے ایک عظیم کارنامہ سرانجام دیا۔

گوکہ اکثر مؤرخین نے اپنی اپنی کتب میں شاہنامہ فردوسی کے اشعار کو تحریر کیا ہے مگر ان کی جو تشریح کی ہے وہ بالکل سطحی ہے۔ کبھی ان اشعار کی گہرائی میں جا کر بلوچ نسلی اصلیت اور ان کے اصل کردار وعمل کا جائزہ نہیں لیا گیا۔ اگر بغور اور زیادہ گہرائی کے ساتھ ان اشعار کا جائزہ لیا جائے تو ان میں بلوچ نفسیات بھی واضع طور پر نظر آئیگی یعنی کہ انھوں نے ہر اس طاقت کو للکارا جنھوں نے ان کی سرزمین پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے باہر کی دنیا میں جتنے فتوحات کئے وہ دیگر طاقتوں کیلئے کرتے رہے اپنی ذات یا اپنے جغرافیہ میں اضافہ کیلئے بلوچ نے کبھی توسیع پسند پالیسی اختیار نہیں کی۔ کتنی قومیں اور بادشاہتیں تھیں جو ان کی مدد و کمک سے بام عروج تک پہنچ گئے ایران کے قدیم پیش دادی ،میدی (Medians)، ،ہخامنشی (Aschamanid)، آشکانی، ساسانی، عرب، مغل، افغان اور ترک وغیرہ مگر ماسوائے مال غنیمت میں حصہ دار بننے کے کبھی ملک گیری میں شامل نہ ہوئے ،آزادی پسندی اسکی سرشت میں شامل ہے اور فردوسی اپنے اشعار میں محمود غزنوی کو بار بار ان کے ماضی کی تصویر دکھا کر کہہ رہا ہے کہ یہ پیدائشی سپاہی ہیں اور جنگوں میں مینڈھے کی طرح ٹکریں مارتے ہیں انھوں نے کبھی کسی کی سیادت قبول نہیں کی اور ہر غاصب کے

خلاف لڑتے رہے ہیں اور آج کا بلوچ بھی بعینہ ماضی قدیم کے بلوچ کی طرح اپنی قومی اور وطنی آزادی کا خواہاں ہے وہ سب کچھ کرسکتا ہے مگر وطن پر کبھی سودابازی نہیں کرتا یہی اسکی نفسیات ہے اور یہی اسکا ماضی ہے جو فردوسی نے بھی خوب خوب بیان کیا ہے۔ یہ کہانی جو ہخامنشی خاندان 558ق م تا330 ق م سے بھی قبل سے شروع ہوکر ساسانی خاندان226ء تا634ء تک پہنچتی ہے بلوچوں کے عظیم عروج وزوال کی کہانی ہے اس دور کے بعد بلوچوں کو اتنا عظیم عروج کبھی حاصل نہ ہوسکا جتنا کہ انھیں بحیثیت سپاہی شاہان ایران کے مختلف خاندانوں کے دور میں حاصل تھا۔

اس مستند منظوم مجموعہ کے علاوہ بلوچوں کے بارے میں کچھ دیگر مؤرخین کی قدیم تحریری تاریخی دستاویزات بھی موجود ہیں جن میں بلوچوں کا ذکر طمطراق کے ساتھ کیا گیا ہے۔ البتہ ان میں سے بعض کتابوں میں ان کی قومیت کی بجائے شہریتی یا قبائل کے نام لکھے گئے ہیں جیسے کہ بحیرہ ہیرکانیہ، بحیرہ خزر (Caspian Sea) کے رہنے والے بلوچ ہیرکانی، کرمان کے بلوچ کرمانی، (لسبیلہ) کے بلوچ اور یطائی، جاسک کے رہنے والے جاسکی وغیرہ۔ گوکہ فردوسی بھی بعض جگہوں پر ان کی شہریت کا ذکر کرتا ہے لیکن دیگر تاریخی مسودات اور کتب میں ان کے شہریتی نام بکثرت ملتے ہیں۔ توراکینہ قاضی نے اپنی تصنیف سائرس اعظم میں مسلسل ان کی علاقائی یا شہریتی ناموں کا تذکرہ کیا ہے ان شہریتی ناموں کی وجہ سے بعض اوقات اس مضمون یا اس قوم کی تاریخ سے نابلد قاری کو ان کے بارے میں مشکلات پیش آتی ہیں چونکہ بلوچوں کی تمام تر آبادی بحیرہ خزر، کوہ البرز، دشت لوط (صحرائے ایران) اس دشت میں بہت سارے شہر تھے جن کی آبادی بلوچوں پر مشتمل تھی) اور ساحل مکران اور اسکے گردونواح کے علاقے کرمان اور اس کے گردونواح کے علاقے سراوان، جھالاوان، اور بیلہ وغیرہ میں پھیلی ہوئی تھی لہٰذا توراکینہ قاضی سمیت اکثر و بیشتر مؤرخین انھیں ان کے علاقوں سے منسوب کرکے علاقائی یا شہریتی نام دیتے ہیں مثال کے طور پر اگر کسی شخص کا تعلق خضدار سے ہے اور وہ بلوچ ہے مگر اپنے نام کے ساتھ سابقہ کے طور پر خضداری لکھتا ہے تو یہ اسکی شہریت ہوگئی لہٰذا توراکینہ قاضی اور دیگر مؤرخین نے اکثر و بیشتر اپنی تحریروں میں اسی طرح کے نام لکھے ہیں۔

شاہنامہ فردوسی سے بھی بہت قدیم کتاب یعنی تاریخ کی پہلی کتاب "دی ہسٹری آف ہیرو ڈوٹس (The History of Herodotus)" میں بھی بلوچوں کے تذکرے موجود ہیں اور

ان کے شہریتی اور علاقائی ناموں کی ایک لمبی لائن ہے اسکے علاوہ اسی کتاب میں بلوچوں کے بہت سارے قبائل کے نام بھی موجود ہیں۔ کچھ عرصہ قبل تک یہی کہا جاتا تھا کہ تاریخ میں بلوچوں کا تذکرہ سب سے پہلے ابن حوقل نے اپنی تصنیف صوۃ الارض میں 950ء میں کیا ہے لفظ بلوچ کے استعمال تک شاید یہ بیان درست ہو لیکن اگر شہریتی علاقائی اور قبائلی ناموں کو مدنظر رکھا جائے تو تاریخ کی پہلی کتاب (History of Herodotus) وہ قدیم نسخہ ہوگا جس میں پہلی بار بلوچوں کا تذکرہ کیا گیا۔ اس طرح قدامت کے لحاظ سے یہ اعزاز ہیروڈوٹس کا ہے کہ جس نے بہت سارے نظریات اور قیاسات کی نفی کردی ہے کہ جو آج تک بلوچوں کے بارے میں مستعمل تھیں یعنی عربی نسل، کلدانی، آرین، ترکمان، انڈین نسلوں سے تعلق کے نظریات و قیاسات وغیرہ۔

اس کے علاوہ بلوچی تحریر کی قدامت اور اس بات کی صداقت پر کہ بلوچ ساسانی خاندان سمیت ہر ایرانی دربار میں موجود رہے ہیں وہ تحریر مہر تصدیق ثبت کرتی ہے جو ایران کے قدیم نسخوں سے برآمد ہوئی ہے اور جسے سید ظہور شاہ ہاشمی نے اپنی تصنیف بلوچی زبان وادب کی تاریخ ایک جائزہ میں نقل کی ہے اس کا مضمون کچھ یوں ہے

"دیم ءِ خسرو سیاہ بیت کہ نامہ پیغمبرءِ دریت یعنی خسرو کا منہ کالا ہوا کہ اس نے پیغمبر کا خط پھاڑ ڈالا۔132 اگر اس تحریر کی صداقت پر یقین کیا جائے تو پھر یہ بات مکمل طور پر ثابت ہوتی ہے کہ ایرانی شاہی دربار کسی بھی دور میں بلوچوں کی موجودگی سے خالی نہیں رہا حتیٰ کہ بلوچ جرنیلوں (قبائلی میر) اور ایرانی شاہی خانوادوں کے درمیان رشتہ داریاں بھی ہوئی تھیں یہی وجہ تھی کہ بلوچ شاہی دربار، شاہی فوج اور امور مملکت میں مرکزی کردار ادا کرتے تھے اور شاہنامہ فردوسی بھی اس غلبے کو تسلیم کرتا ہے۔ The History of Herodotus کے مطابق جب شاہ زرکسیز ہخامنشی نے 480ق م میں روم پر لشکر کشی کا ارادہ کیا اور اس مقصد کی خاطر اس نے مختلف اقوام سے مسلح لشکر جمع کرنے شروع کئے تو اس کی سپاہ میں بلوچ بھی تھے جنھوں نے تھرماپالے (Thormopyle) کی جنگ میں بھرپور حصہ لیا تھا۔ اس جنگ میں شاہ زرکسیز کو شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا اور وہ دوبارہ ایران کی جانب پسپا ہوا تھا۔ اس لشکر میں بابائے تاریخ ہیروڈوٹس بلوچوں کا ذکر کچھ یوں کرتا ہے۔

پارکانی (بلوچ) سپاہ کا کماندار سیرومترس تھا اور یہ تیر و کمان اور خنجروں سے آراستہ

تھے۔133

اس طرح ان کے جن اٹھارہ قبائل کے نام تحریر کرتا ہے اور جن کی تفصیل پچھلے اوراق میں دی جا چکی ہے ان میں سے کچھ شہریتی اور علاقائی نام ہیں مثلاً زرنجی سے مراد زرنج (سیستان کا دارالخلافہ) کے رہنے والے۔ یہ یقیناً کسی مخصوص قبیلے سے متعلق الفاظ نہیں ہیں بلکہ زرنج میں رہنے والے تمام لوگوں پر صادق آتی ہے بعض ایسے قبائل کے نام بھی موجود ہیں جن کا اب نام و نشان نہیں ملتا یا چند ایک کسی بڑے اور مضبوط قبیلے کے طائفے کے طور پر زندہ ہونگے مگر کچھ ایسے قبیلوں کا بھی تذکرہ ہے جو اب تک مضبوط جمعیت اور پوزیشن کے ساتھ موجود ہیں۔ مثلاً ناہروئی، ساجدی، مید، بلدائی (بلیدی) وغیرہ۔

ہیروڈوٹس مزید کئی جگہوں پر بلوچ قبائل کا تذکرہ کرتا ہے اب اگر ان بیانات پر غور کیا جائے تو کسی شک وشبہ سے بالا اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ بلوچ عرب ادوار سے پہلے قبل از مسیح میں خطہ بلوچستان میں آباد تھے اور ایک مضبوط قوت کے مالک تھے اور اتنی جمعیت رکھتے تھے کہ بڑے بڑے حکمران فوجی امداد اور ضروریات کی خاطر ان کی طرف رجوع کرتے تھے اور ان سے افرادی قوت لیتے تھے اور اس کے بدلے بلوچ بڑے بڑے مراعات کے مالک تھے اور ان کی پہنچ ایران کے شاہی دربار تک تھی اور ان بیانات پر ہمیں یقیناً یقین کرنا ہی پڑے گا کیونکہ اگر ہیروڈوٹس کے یہ بیانات غلط ہوتے تو ان کے (ہیروڈوٹس کے) ڈیڑھ ہزار برس بعد فردوسی بعینہ انہی الفاظ میں بلوچوں کا تذکرہ شاہنامہ فردوسی میں نہ کرتا گویا فردوسی نے ہیروڈوٹس کے بیانات پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔

شاہنامہ کی رو سے بلوچستان (بلوچ وطن) بحیرہ خزر سے ساحل مکران تک اور کرمان سے درہ بولان تک سات ایرانی بادشاہوں کے تحت رہا ہے یعنی کیکاؤس، کیخسرو، لہراسپ، گشتاسپ، بہمن، ہما اور دراب فردوسی کے بقول ان تمام بادشاہوں کے دور میں بلوچوں کا کردار بڑا ہی اہم اعلیٰ وارفع اور فاتحانہ رہا۔

ہیروڈوٹس کے بعد شاہنامہ فردوسی کے چند مزید اقتباسات کا جائزہ لینا ضروری ہے تاکہ منزل کی جانب ایک قدم اور آگے بڑھا جا سکے مگر اس سے قبل مشہور یونانی قدیم مورخ ایرین کے کچھ بیانات پر روشنی ڈالنا بہتر ہوگا جو سکندر کی واپسی کے دوران مکران میں موجود قبائل کے بارے

میں لکھتا ہے۔

سکندر اکتوبر 325 ق م کے شروع میں اپنے اس تکلیف دہ سفر پر روانہ ہوا اس نے اپنی فوج کے ایک حصے کو جس کو کہ وہ اپنے ساتھ نہیں لینا چاہتا تھا اپنے ایک فوجی افسر ہافاچین (Hophoccin) کے سپرد کر دیا اور باقی ماندہ فوج کو جو زیادہ تر سوار دستوں پر مشتمل تھی اپنے ساتھ لیکر سمندر کا رخ کر کے دریائے اربینس 134 کی جانب روانہ ہوا وہ خود سمندر کے دائیں جانب رہا تاکہ ساحل کے ساتھ ساتھ جس قدر زیادہ ممکن ہو سکے کنویں کھدوائے جائیں اور بحری بیڑے کیلئے وافر مقدار میں پینے کے پانی کا انتظام کیا جا سکے اس کا یہ بھی ارادہ تھا کہ اور یتائی کے ہندی قبیلہ پر دھاوا بول دیا جائے جو ایک عرصہ دراز سے خود مختار چلا آ رہا تھا اور چونکہ اس قبیلے کے لوگوں نے سکندر کی فوج کیلئے کوئی قابل قدر خدمت انجام نہیں دی تھیں اور اسکی طرف دوستی اور خیر سگالی کا ہاتھ بڑھانے میں پس وپیش سے کام لیا تھا۔ دریائے اربینس کے مشرقی جانب ایک اور آزاد قبیلہ اریبائی آباد تھا اور جب ان لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ سکندر کی فوج ان کی طرف بڑھ رہی ہے تو یہ لوگ ویرانہ اور صحرا کی طرف بھاگ نکلے اور شمالی پہاڑیوں میں پناہ لی کیونکہ یہ لوگ نہ سکندر کی اطاعت قبول کرنے پر تیار تھے اور نہ اسکی فوج کے ساتھ مقابلہ کرنے کی طاقت رکھتے تھے۔135

سکندر نے دریائے اربینس کو عبور کیا جو زیادہ گہرا تھا اور نہ زیادہ چوڑا بلکہ یہ ایک پایاب ندی کی صورت میں بہتا تھا وہ رات کے وقت صحرا کے ایک بڑے حصے کو طے کر کے آبادی کے قرب و جوار میں پہنچ گیا۔ یہاں اس نے توپ خانے کو اپنے پیچھے پیچھے منظم صورت میں چلنے کا حکم دیا اور گھڑ سواروں کو اپنے ساتھ لیکر ان کو کئی دستوں میں تقسیم کر کے میدانی علاقے کے ایک وسیع رقبے میں پھیلا دیا۔ اس طرح اس نے اور یتائی (لسبیلہ) کے علاقے پر اپنا حملہ شروع کر دیا ان میں سے وہ لوگ جنھوں نے مزاحمت کی موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے اور بہت سے لوگ زندہ گرفتار کر لئے گئے۔ اس کے بعد اور یتائی کے سرکردہ افراد سکندر کے پاس چلے آئے اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا۔ اس نے ان کو حکم دیا کہ وہ اور یتائی قبیلہ کے لوگوں کو جمع کر کے ان کے گھروں کو روانہ کر دیں کیونکہ وہ ان کے ساتھ کوئی بدسلوکی کرنیکا ارادہ نہیں رکھتا ہے اس نے ان لوگوں پر اپولو فینس (Appolophinus) کو سٹریپ (عامل) مقرر کر دیا اور اسکے ساتھ اس نے لیون ناٹو

(Leonato) کو بھی جو محافظ دستے کا ایک اعلیٰ افسر تھا چھوڑ دیا اور فوجی دستوں کی کمان اس کے سپرد کر کے اسکو ہدایت کی کہ وہ بحری بیڑے کے اس مقام سے گزرنے تک بدستور رمبکیہ (وہ شہر جہاں سکندر سفر مکران و بیلہ کے پہلے مرحلے میں پہنچا تھا) میں قیام کرے اور شہر میں ایک نو آبادی بسائے اور اور یتائی لوگوں میں نظم و نسق اور امن قائم رکھے تاکہ یہ لوگ سٹریپ (عامل، گورنر) کی فرمابرداری اور وفاداری کا دم بھرنے کیلئے آسانی سے تیار ہو سکیں۔ اس کے بعد وہ خود اپنی بھاری فوج کے ساتھ ایک نہایت دشوار گزار راستے سے گیدروشیا کے علاقے کی جانب روانہ ہوا۔ اس طرح سکندر کو ساحلی علاقوں میں ماہی گیروں کی بستیاں بھی ملی تھیں جن کی عمومی خوراک مچھلی تھی اور وہ مچھلی کے ہڈیوں سے بنے ہوئے جھونپڑوں میں رہتے تھے جن کو یونانیوں نے اچھیتی فیگوئی کا نام دیا تھا۔ 136

درج بالا اقتباسات میں چند قبائل کا ذکر آیا ہے یعنی اور یتائی، اریبائی، گیدروزیائی اور اچھیتا فیگوئی وغیرہ یہ نام بھی دراصل جھلاوان، بیلہ اور مکران کے باشندوں کے شہریتی نام تھے نہ کہ قبائلی یا خاندانی نام جہاں تک ان قبائل کے ہندی ہونے کا تعلق ہے تو یہ سراسر غلط مفروضہ ہے چونکہ یہ قبائل ہندوستان کی سرحد سے قریب رہتے تھے اور یونانیوں کا پہلی بار ان سے واسطہ پڑا تھا چنانچہ نہ صرف انھیں ہندی قبائل کہا گیا بلکہ ان کی شہروں اور علاقوں کی مناسبت سے انھیں مختلف نام بھی دیئے حالانکہ سمتھ ایرین ہی کے حوالے سے لکھتا ہے کہ "اور یتائی لوگوں کی زبان اور ان کے رسم و رواج ہندیوں سے مختلف تھے"۔ 137 اسی طرح اریبائی سے اربوئی لفظ بنا جو وسطی بلوچستان کا سب سے طویل پہاڑی سلسلہ ہے اور یہی لفظ آہستہ آہستہ کثرت استعمال سے براوئی بنا۔ بلوچ براہوئی قبائل آج بھی اسی پہاڑی سلسلے کی وادیوں اور دامنوں میں آباد ہیں۔

وہ داریوش کی رعایا تھے اور یہ علاقہ بھی اسکی سلطنت کا حصہ تھا۔ اسی طرح وہ اچھیتا فیگوئی کا نام بھی خود سے ساحلی قبائل کو دیتے ہیں، نہ کہ یہ نام پہلے سے ان کا تھا اسی طرح امیر البحر نیروخس (Nerocus) کو بھی ساحلی علاقوں میں جہاں جہاں وہ لنگر انداز ہوا انہی قبائل سے واسطہ پڑا تھا اور انھوں نے زبردست مزاحمت پیش کی تھی۔ ایک جھڑپ کے دوران یونانیوں کو شدید نقصان پہنچا تھا لیکن یونانیوں کے 40 ہزار کے لشکر کے مقابلے میں مقامی قبائل کے 11 ہزار کا لشکر منظم مزاحمت پیش نہ کر سکا مختلف جنگوں میں ان کے 6 ہزار کے قریب جنگجو مارے گئے ان کے بیشتر سر

کردہ میر و معتبر اس جنگ کی نذر ہو گئے۔ 138 اس طرح یونانیوں نے مکران سے واپسی پر بلوچوں کا زور توڑنے میں بہت مشکل سے کامیابی حاصل کی۔

سکندر کے سفر کی روداد اور امیر البحر نیروخس کی مہم جوئی کی داستان لکھنے کا اصل مقصد یہ تھا کہ دیکھا جائے کہ کیا واقعی مکران میں اس وقت انسانی آبادی تھی لہٰذا اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچی کہ مکران میں لوگوں کی ایک کثیر آبادی موجود تھی اور یہ وہی قبائل تھے جنکا تذکرہ بابائے تاریخ ہیروڈوٹس نے کیا ہے اور انہی قبائل سے شاہان ایران اپنے فوجی دستے ترتیب دیتے تھے۔ جن قبائل کا تذکرہ ہیروڈوٹس نے کیا ہے ان میں سے اکثر قبائل آج بھی اپنے انہی یا ان سے ملتے جلتے ناموں سے آج بھی مکران میں سکونت رکھتے ہیں۔ مکران میں آباد قبائل کے بارے میں وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ قبائل بلوچ تھے عرب دور کے مؤرخین بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ 139

تو راکینہ قاضی نے بلوچوں کے علاقائی اور شہریتی نام کثرت سے استعمال کئے ہیں البتہ بعض اوقات وہ ان کے قومی اور قبائلی نام بھی تحریر کرتی ہیں۔ انھوں نے جن علاقوں کے حوالے دیئے اور جن سے بلوچوں کو منسلک کیا ہے ان علاقوں کے نام شاہنامہ فردوسی میں بھی ملتے ہیں سائرس اعظم کے بارے میں وہ لکھتی ہیں کہ:

جب سائرس کو میدیوں نے پہلی بار گرفتار کیا تو ملکہ ماندین اور سپہ سالار ہارپیگ نے اس کی جان اس طرح بچائی کی اسے صحرا نمک (دشت لوط) کے باشندوں کو زیر کرنے کیلئے ایک مہم پر بھیجا اس بارے میں ملکہ ماندین اور ہارپیگ سائرس سے کچھ یوں مخاطب ہوئے کہ وہاں تہذیب کی روشنی سے دور نمک کے سمندروں کے کنارے بے شمار وحشی قبائل آباد ہیں تم انھیں مطیع و منقاد بنا کر بڑی عزت و شہرت حاصل کر سکتے ہو کیونکہ ان قبائل پر آج تک کسی نے حملہ نہیں کیا ان کی شوریدہ سری اور آزادروی مسلم ہے۔ 140

مذکورہ مصنفہ مزید لکھتی ہیں کہ:

اسے اس کے باپ سے ملوائے بغیر اگبتانا سے باہر اجنبی پہاڑی علاقوں اور وحشی قبائل کے گھاس کے میدانوں میں بھیجا جا رہا تھا جو دنیا سے بالکل کٹے ہوئے تھے جن کے متعلق کوئی نہیں جانتا۔ 141

جب سائرس نے دایانی یا دابانی، ماردی (مردی) اور بہت سے دیگر وحشی قبائل پر قابو پالیا تو

اسی جنم کے ایک اور ... سے الگ ... بیرونی حملوں سے یا ایرانی قبائل اس کے قابو میں آ گئے ہیرکانیوں نے سائرس کی اطاعت قبول کرنے کے بعد اسے بتایا کہ صدیاں پہلے بھی ان کی سر زمین آریہ حملہ آوروں کی یلغار کا نشانہ بنی تھی اور بری طرح تباہ و برباد ہوئی تھی اسے سنبھلنے میں طویل مدت لگی تھی۔ 142

اسی طرح تورا کینہ قاضی نے اپنی تالیف میں اور بہت سارے صحرا نمک (دشت لوط اور بلوچستان کے صحرائی علاقے) کے آزاد قبائل کا تذکرہ کیا ہے۔ اس میں کرمانیوں اور ہیرکانیوں کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ تورا کینہ قاضی کے بیانات کے مطابق کرمانی پورے کرمان، صحرا لوط، مکران اور سیستان پر قابض تھے اور ان کا سردار تابال کرمانی تھا۔ 143 جو اپنے آپ کو بادشاہ کہلواتا تھا۔ ہیرکانی اور پارتھی بحیرہ خزر کے آس پاس رہتے تھے البتہ کوہ البرز کا علاقہ ہیرکانیوں کے تصرف میں تھا پارتھی میدانی علاقوں پر قابض تھے یہ علاقہ گشتاسپ پارتھین کے زیر اثر تھا شاہنامہ فردوسی کے مطابق سیستان پر رستم کی حکمرانی تھی اور تاریخی حقائق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رستم بلوچوں کی نابروئی قبائل سے تعلق رکھتا تھا۔ 144 جنکا تذکرہ مختلف مؤرخین کے علاوہ ہیروڈوٹس نے بھی کیا ہے جبکہ ہیرکانیوں کے بارے میں تورا کینہ قاضی لکھتی ہے کہ ان کی ایک بڑی تعداد میڈیا اور ایرانی ہخا منشیوں کی فوج میں شامل تھی۔ 145 دراصل ہیرکانیہ بحریہ خزر یعنی Caspian Sea کا قدیم نام ہے اسی کی مناسبت سے یہاں کے باشندے ہیرکانی کہلائے جانے لگے جو کہ ان کا علاقائی اور شہریتی نام تھا۔ کوہ البرز بحیرہ خزر کے جنوب میں شرقاً غرباً پھیلا ہوا پہاڑ ہے اسکی بلند چوٹی کا نام دماوند ہے اسی میں ہیرکانیوں کے قلعے اور آبادیاں تھیں انہی ہیرکانیوں کے بارے میں فردوسی لکھتا ہے کہ یہ کوچ و بلوچ تھے؛

ہمی پہلی پارس کوچ و بلوچ۔

اسی طرح مکران میں بلوچوں کی موجودگی کی تصدیق بابائے تاریخ ہیروڈوٹس نے بھی کی ہے۔ شاہنامہ فردوسی موجودہ سراوان میں کوہ چلتن کا ذکر کرتا ہوا بلوچوں کو یہاں پر آباد بتاتا ہے۔ اس میں یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ وہ کک کوہزاد ایک افغان کے ماتحت تھے جو کہ افراسیاب شاہ توران کی جانب سے یہاں کا گورنر تھا اور بلوچوں سمیت کئی دیگر اقوام اسکی فوج میں شامل تھے۔ کک کوہزاد کی ایک نشانی ایک چھوٹے سے گاؤں کوش کک کے نام سے اب بھی چلتن کے پہلو

میں واقع ہے جہاں بلوچ قبائل رہتے ہیں اسطرح کا نک (کہنہ کک) بھی کک سے متعلق بیان کی جاتی ہے۔

علاوہ ازیں عرب مؤرخین نے صحرا لوط، کرمان، مکران، سیستان، خراسان وغیرہ میں انھیں کوچ و بلوچ کے نام سے تحریر کیا ہے۔ عرب مؤرخین دسویں صدی عیسوی میں پنجگور کا ذکر قنز بور، تنز بور یا پنج بور کے نام سے کرتے ہیں اور یہ بھی لکھتے ہیں کہ وہاں ایک کچا قلعہ تھا جس میں پانی ایک نہر کے ذریعہ پہنچتا تھا وہاں پر ایک جامع مسجد تھی اور وہاں کے باشندے بلوچ تھے۔ 146

علامہ ابن خلدون انھیں پہاڑی لوگ بادیہ نشین حروسیہ اور جاسکیہ لکھتا ہے جبکہ مقدسی، ادریسی، عبداللہ، یاقوت، ناصر خسرو ابن خرداد بہ، اصطخری، قزوینی، طبری، علامہ شبلی نعمانی اور ملک الشعرا بہار انھیں کوچ، بلوچ، بلوص، کفسی، کفچی، قفشی، قفصی وغیر کا نام دیتے ہیں۔ ابن حوقل انھیں بلوچ لکھتا ہے۔ فردوسی کوچ و بلوچ اور قفچ و بلفچ کے ناموں سے انھیں یاد کرتا ہے۔ تورا کینہ قاضی ان کے علاقائی، شہریتی اور قبائلی نام تحریر کرتی ہے، یعنی کرمانی، ہیرکانی، دایانی، ایبری، ماردی، (مردی، مہردی) وغیرہ میں کچھ علاقائی اور کچھ قبائلی نام ہیں۔

ایرین (Arian) انھیں اوریتائی، اچیتا فیگوئی، گیدروشیائی اور اریبائی کے ناموں سے یاد کرتا ہے اور ہیرلڈ لیم (Herald Lamb) بھی اس کی تقلید کرتا ہے۔ 147 تورا کینہ قاضی جہاں صحرائے نمک اور اندرون بلوچستان کے سینکڑوں وحشی اور سرکش قبائل کا تذکرہ کرتی ہے تو ساتھ ہی کرمانی اور ہیرکانی بلوچوں کے ہخامنشیوں کیساتھ گہرے تعلقات اور روابط پر بھی اتفاق کرتی ہے۔ تابال کرمانی جو کرمانی بلوچوں کا خود مختار حاکم تھا جب وہ سائرس کا اتحادی بن گیا تو دونوں نے لیڈیا (ایشیاء کوچک Asia Minor ترکی اور آذربائیجان کا علاقہ) پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا۔ تابال کو وہاں کا گورنر مقرر کیا گیا اور لیڈیا کے خزانے اس کی تحویل میں دے دیے گئے۔ تابال تمام زندگی اپنے کرمانی لشکر کے ساتھ سائرس کا ساتھ دیتا رہا۔ 148 اسی طرح ہیرکانیوں کا سردار (بادشاہ) گشتاسپ پارتھی بذات خود تو سائرس کے لشکر میں شامل نہیں ہوا لیکن ہیرکانی جنگجوؤں کی ایک بڑی تعداد کو اس کے ساتھ کر دیا حتیٰ کہ یہی ہیرکانی بلوچ سردار انتہائی شمالی مہمات (کوہ ہمالیہ کی مہمات) میں سائرس کے ساتھ تھے اور شدید برفانی طوفان میں سائرس کے ساتھ ملکر مساگت اقوام پر حملہ آور ہوئے تھے۔ 149 جو کہ آرین نسل کے تھے یہی ہیرکانی اور کرمانی، ہخامنشی

افواج کا بہترین دستہ ہوتے تھے جنھیں اسوارن کہا جاتا تھا اور یونانی انھیں ایران کے لافانی شاہی محافظ کے نام سے یاد کرتے تھے۔150 اسی طرح دایانی یا دابانی، ابیری، ماردی اور دیگر بہت سارے غیر آرین قبائل و اقوام بھی سائرس کی افواج میں شامل تھے۔ جسطرح توراکینہ قاضی نے ہخامنشی فوج کا تذکرہ کیا ہے بالکل اسی طرح فردوسی بھی اس فوج کا منظوم انداز میں یہی نقشہ پیش کرتا ہے فرق صرف یہ ہے کہ توراکینہ قاضی نے بلوچوں کوان کے شہریتی اور قبائلی ناموں سے یاد کیا ہے جبکہ فردوسی انھیں ان کی اصل قومیت بلوچ کے نام سے لکھتا ہے یا پھر کوچ و بلوچ کا نام استعمال کرتا ہے۔

یہ قبائل سائرس اعظم پہلا ہخامنشی فرمانروا (558 ق م 530 ق م) کے دور سے بھی صدیوں پہلے اسی پہاڑی اور صحرائی اور ان سے متصل علاقوں میں آباد تھے بلکہ سائرس کے آباؤ اجداد آرین کے حملوں 1500 ق م سے بھی قبل بلوچ اس صحرا اور متذکرہ بالا علاقوں میں آباد تھے۔ جس طرح ابیری قبیلے کے لوگ سائرس سے کہتے ہیں کہ صدیوں پہلے آریاؤں نے انکے علاقے کو تاخت و تاراج کیا تھا اور انھیں سنبھلنے میں کافی لمبا عرصہ لگا تھا۔ اس ایک بیان سے ہی ان پہاڑی اور صحرائی قبائل کی قدامت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جو 1500 ق م سے بھی قبل اس خطے میں آباد تھے۔

جس طرح بعض مؤرخین لکھتے ہیں کہ بلوچ قبائل کرمان میں بعد میں وارد ہوئے ہیں مندرجہ بالا مستند مؤرخین کے بیانات کے بعد ان کے باتوں کی تردید ہو جاتی ہے۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ بلوچ کہیں باہر سے آنے والے مہاجر اور حملہ آور یعنی آرین، کشان، ساکا، ہن، سفید ہن، عرب، دراوڑ، تاجک وغیرہ نہیں ہیں بلکہ ان کا خمیر اسی سرزمین سے اٹھایا گیا ہے جو بحیرہ ہیرکانیہ (Caspian Sea) سے لیکر جنوب میں بندر بلوچ (بندر عباس) تک مغرب میں کرمان سے لیکر مشرق میں بولان تک یہ تمام خطہ اس وقت یعنی چھٹی صدی قبل مسیح تک متحد نہیں تھا مگر اسکا یہ بھی مطلب نہیں کہ یہاں لاقانونیت تھی بلکہ اسکی وجہ یہ تھی کہ اولاً یہ ایک وسیع و عریض علاقہ تھا جہاں آباد قبائل کافی فاصلوں پر آباد تھے اور ان کے درمیان رابطوں کا فقدان تھا اور دوئم یہ کہ اس سے قبل کسی طاقتور بادشاہ نے انھیں کبھی فتح کرنے میں کامیابی حاصل نہیں کی تھی۔ وہ اپنے جغرافیائی حدود میں آزاد و خودمختار کنفڈریشنوں (اتحادیوں) کی صورت میں رہتے تھے

اس وقت عام مشاہدے اور تحقیق کے مطابق بلوچ قبائل چار کنفڈریشنوں میں منقسم تھے ہر کنفڈریشن میں مختلف سرکردہ قبائل حکمران (خان) تھے یہ کنفیڈریشن کرمان، ہیرکانیہ، مکران، اور سیستان کی تھیں بولان سمیت سراوان و جھالاوان کے بلوچ توران کی عظیم الشان سلطنت میں شامل تھے جو سیستان سے لیکر ساحل مکران تک پھیلی ہوئی تھی بعد ازاں سیستان پر ناہروئی بلوچوں نے قبضہ کرلیا اور سراوان کا سارا علاقہ بھی ان کی تصرف میں آ گیا بقول فردوسی سراوان میں بھی اس وقت دیگر قبائل کے ساتھ ساتھ بلوچ بھی آباد تھے یعنی

نشتند در آں دشت بسیار کوچ   زاوگان ولاچین وکرد و بلوچ

اس طرح سراوان کا علاقہ سیستانی کنفیڈریشن میں شامل ہوا سیستان پر ناہروئی کرمان پر کرمانی (کوچ و بلوچ) ہیرکانیہ پر پارتھی (آرین) مکران پر اور ریتائی اور گیدروزیائی بلوچ قبائل کو بالادستی حاصل تھی بد قسمتی سے ان کنفیڈریشنوں کے بارے میں تحریری مواد نہیں پایا جاتا مگر مؤرخین اشاروں، کنایوں میں ان کا ضمناً تذکرہ کرتے رہتے ہیں اور شاہنامہ فردوسی اور سائرس اعظم سمیت دیگر بہت سا تاریخی مواد پانچویں اور چھٹی صدی ق م یعنی ہخامنشی دور سے تعلق رکھتا ہے اور ان تاریخی اسناد میں ان قبائلی تحفظات کے تحت چلنے والی کنفیڈریشنوں کا تذکرہ موجود ہے۔

ہیروڈوٹس کا حوالہ بھی ہخامنشی دور کے ابتدائی ادوار سے تعلق رکھتا ہے جس میں وہ تحریر کرتا ہے کہ 480 ق م کے لگ بھگ شہنشاہ ایران رزکسیز نے مکران کے قبائل سے ایک لشکر تیار کیا۔ ایرین انھیں یونانی دور یعنی سکندر کے حملوں کے دوران مکران میں آباد بتلاتا ہے اور سکندر کے ساتھ ان کی جنگوں کا بھی حال لکھتا ہے۔ عرب مؤرخین نے چونکہ مابعد اسلام کرمان اور صحرائے نمک (دشت لوط) کو سیاحت کی غرض سے جاتے ہوئے عبور کیا تھا انھیں صحرا میں صرف کوچ و بلوچ نظر آئے تھے۔ یہ دور آٹھویں نویں اور دسویں صدی عیسوی کا تھا۔ طبقات ناصری کا مصنف مولانا منہاج الدین سراج مشہد کے قریب ایک مقام گمبد بلوچ کا تذکرہ اپنی کتاب میں کرتا ہے۔151 لہٰذا ان دلائل اور تاریخ شواہد سے واضح ہوتا کہ بلوچ کہیں باہر سے آنے والے کسی بھی گروہ سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ وہ ابتدا ہی سے اسی خطے میں آباد چلے آ رہے ہیں جس میں وہ اب تک آباد ہیں یعنی بلوچستان (بلوچ سرزمین)۔

سائرس اعظم نے اقتدار سنبھالتے ہی ان کنفیڈریشنوں کو ایرانی ہخامنشی سلطنت کے ساتھ

پیوست کرلیا لیکن مکران میں اسکی فوجیں تباہ ہوگئیں حتیٰ کہ صرف 7 سپاہیوں کے ساتھ وہ جان بچا کر بصد مشکل ایران پہنچ سکا تھا۔152 مکران بعدازاں داریوش اول نے فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ان کنفیڈریشنوں کا ایرانی سلطنت میں شامل ہونا ان کے اتحاد کا باعث بنا کیونکہ ہخامنشی فرمانروا روادار اور منصف حکمران تھے انھوں نے ان قبائل کی بہادری سے جہاں بے شمار فوائد حاصل کئے وہاں ان کی فوج میں اعلیٰ وارفع مقام کے ساتھ خوب مراعات بھی دیں۔

کرمان کے طوفانی دستے اسواران کہلاتے تھے جو شہنشاہ کے ذاتی محافظ بھی تھے اور ان کی کمان کیلئے سالار بھی خود سائرس اعظم یعنی صرف شہنشاہ منتخب کرتا تھا چنانچہ ان کا پہلا سالار فرناسس تھا جس کی ڈھال پر چیتے کی شبیہہ بنی ہوئی تھی اور وہ خوب مسلح تھا۔153 اسوارن (بلوچ دستہ) کے علم پر بھی چیتے کی شبیہہ بنی ہوئی تھی بقول فردوسی:

درفش بیاوردہ پیکر پلنگ

ہیرکانی بلوچوں کا دستہ الگ تھا اور لشکر کا یہ دستہ 10 سرداروں کے ہاتھوں میں تھا۔تابال کرمانی کے دستے کی قیادت خود تابال کے ہاتھوں میں تھی۔جب تابال لیڈیا (Asia Minor) کا گورنر مقرر ہوا تو گوبارو نے ان کی قیادت سنبھالی جو کہ نسلاً عیلامی تھا۔سائرس نے دیگر قبائل کے الگ الگ دستے مقرر کئے اور انھیں مختلف سرداروں کے ماتحت کردیا۔اس کی فوج میں اس کی اپنی قوم یعنی آرین نسل کے صرف تین قبائل تھے یعنی ہخامنشی، ماسپیانی اور ماراسپیانی، جبکہ باقی اقوام غیر آرین تھے جنھوں نے ہخامنشی حکومت کے قائم کرنے اور اسے مستحکم رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ان تمام اقوام میں بلوچوں نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔

گو کہ ہمارے پاس کوئی واضح ثبوت نہیں ہے کہ ان (پہاڑی وصحرائی) قبائل کو بلوچ کیوں کہا گیا اور انھیں یہ نام کس نے دیا۔لیکن قیاس کہتا ہے کہ یہ نام انھیں کسی آرین حکمران نے دیا ہو گا۔ابن خلدون بھی انھیں بادیہ نشین (صحرانشین) کہتا ہے اور اور قیاس یہ بھی کہتا ہے کہ یہ لفظ بلوچ کسی فرد واحد کا نام نہیں، کسی جگہ کا نام نہیں اور نہ ہی کسی چیز کا نام ہے یہ ایک اسم صفت ہے جو ان کی بہادری، جفاکشی، تندی وتیزی، حملوں میں طوفانی پن، وفاداری وسادگی اور جنگجویانہ مزاج کو دیکھتے ہوئے ہخامنشی (آرین) حکمرانوں نے انھیں یہ نام دیا ہوگا۔اس سے قبل یعنی آرین حملوں سے قبل یہ قبائل اپنے علاقائی شہریتی اور قبائلی ناموں سے موسوم ہوتے تھے اور اس پورے خطے میں

جسے بلوچستان کہا جاتا ہے اور جو آج تین ممالک میں منقسم ہے پھیلے ہوئے تھے اور مختلف خطوں میں قبائلی تحفظات کے تحت زندگی بسر کرتے تھے۔کئی قبائل ملکر کسی اتحادیے کی بنیاد رکھتے اور پھر انہی قبائلی جغرافیائی حدود میں رہتے۔تجاوز کرنے کی صورت میں ہمسایوں سے چپقلش یقینی ہوتی تھی لہٰذا ان اتحادیوں یعنی کنفیڈریشنوں میں اگرچہ کبھی کبھار جنگیں بھی ہوتی تھیں مگر زیادہ تر ان کے تعلقات خوشگوار رہتے تھے۔بعض اوقات پورے کنفیڈریشن میں رہنے والے قبائل ایک ہی شہریتی نام سے مشہور ہو جاتے جیسا کہ کرمانی اور ہیرکانی قبائل کے ساتھ ہوا۔آج بھی بلوچوں میں بے شمار ایسے قبائل ہیں جو علاقائی اور شہریتی ناموں کے علاوہ اپنے پیشوں کی مناسبت سے بھی مشہور ہیں مثلاً گشکوری (دریائے گیس یا گیش کھور مکران سے آنے والے لوگ)، نچاری (نچارہ کے رہنے والے لوگ)، زہری (علاقہ زہری کے رہنے والے لوگ)، تالبر یا ٹالبر (لکڑی کاٹنے والے لوگ یا لکڑہارا)، بزدار (گلہ بان) وغیرہ وغیرہ ایسے بے شمار قبائل ہیں جو اب بھی ماضی کی طرح شہریتی اور علاقائی ناموں سے جانے جاتے ہیں۔

ہخامنشی دور میں جب یہ کنفیڈریشنیں ایرانی سلطنت کا حصہ بنیں تو اس سے بلوچ قوم اور ان کی سرزمین کو متحد ہونے کا موقع ہاتھ آیا اور پہلی بار سراوان وجھالاوان کے بلوچ قبائل کرمان و ہیرکانیہ کے بلوچوں سے متعارف ہوئے۔جب ہخامنشی حکومت کا خاتمہ 330 ق م میں سکندر اعظم کے ہاتھوں ہوا تو 100 سال کیلئے پورے بلوچ خطے پر یونانی اور بعدازاں ہندوستانی عملداری قائم ہوگئی۔پارتھی اور آشکانی دور میں بھی بلوچ خطہ انارکیت کا شکار رہا اور وہ اتحاد جو ہخامنشی دور میں عمل میں آیا تھا دوبارہ زوال پذیر ہوا اور ایک بار پھر بلوچوں کے خطے الگ الگ کردیئے گئے۔ایک حصہ پر یونانی عملداری قائم ہوگئی اور دوسرے حصے پر ہندوستان قابض ہوا۔جسکی وجہ سے مقامی آبادی شدید متاثر ہوئی۔یہ ایک فطری سی بات ہے کہ جب بیگانہ قوم کے لوگ کسی دوسری قوم میں شامل ہوکر اسے اسکی مراعات اور وسائل سے محروم کردیتے ہیں اس کے حقوق غصب کرتی ہے اور اسے اسکی میراث اور سرزمین سے بے دخل کرنے کی کوشش کرتی ہیں تو اس قوم کی مردہ رگوں میں بھی مزاحمت کرنے کا جذبہ موجزن ہو جاتا ہے۔لہٰذا یونانی اور ہندی اقوام کے غاصبانہ قبضے کے خلاف بھی بلوچ مزاحمت شروع ہوگئی اور برسوں یہ مزاحمت جاری رہی تھی کہ وسطی بلوچستان کو ہندوستانی راجاؤں نے بالکل ہی نظر انداز کیا اور اس کی حیثیت ایک سرحدی فوجی چوکی کی سی ہوکر

رہ گئی ورنہ اندرونی طور پر بلوچ قبائل آزاد اور خود مختار ہو گئے جبکہ بلوچوں کی سرزمین کا وہ حصہ جو یونانی قبضے میں تھا ایرانی اور بلوچ اقوام کی مشترکہ جدوجہد کے نتیجے میں بالآخر یونانی تسلط سے آزاد ہوا۔ آشکانی اور پارتھی دور بھی انتشار کا دور تھا پورا ایرانی خطہ بدترین انارکیت اور طوائف الملوکی کا شکار تھا۔ آخر کار صدیوں بعد 226ء میں ساسانی برسراقتدار آئے ان کے دور حکومت کی ابتدا میں حکومت اور بلوچوں میں پہلے پہل دوستی اور بعد ازاں سیاسی چپقلش اور مسلح تصادم کے نتیجے میں ہیرکانی بلوچوں کو ساسانیوں کی جانب سے زبردست نقصان پہنچا۔ ان واقعات کا تفصیلی تذکرہ پچھلے اوراق میں ہو چکا ہے۔

اس 50 سالہ خانہ جنگی میں ہیرکانی بلوچوں کی ایک بڑی اکثریت ہلاک ہوئی بے شمار لوگ مختلف سمتوں میں فرار ہوئے اور زندہ بچ جانے والوں اور قریبی علاقوں میں روپوش افراد نے امان طلب کر کے نوشیروان کی اطاعت قبول کر لی۔ اس طرح نوشیروان نے انھیں دوبارہ اپنی فوج میں لے لیا اور ان کی بھاری جمعیت کو لیکر ثمرقند پر حملہ آور ہوا اور سفید ہنوں کو شکست دی۔ ساسانی حکومت کا لاکھ ساتھ دینے کے باوجود بلوچوں کے دل میں یہ خلش زندہ تھی کہ ان کی وفاداریاں اور قربانیاں ساسانی بھول گئے جو وہ ایران کے استحکام کیلئے دے چکے ہیں۔ انھیں نوشیروان کے مظالم یاد رہے انھیں یہ بھی یاد تھا کہ نوشیروان نے نہ صرف ان کے ایک وسیع علاقے کو پامال کیا بلکہ ان کا بے تحاشا قتل عام بھی کیا اور ان کے ہزاروں افراد کو علاقہ چھوڑ دینے پر مجبور بھی کیا۔ لہٰذا اکثر و بیشتر بلوچ کرمانی بلوچوں کے ساتھ ملکر ساسانیوں کے خلاف جنگ آزادی کی تیاری کرنے لگے حتیٰ کہ عرب حملوں تک یہ بلوچ انہی علاقوں میں اسی حال میں رہے۔

644ء میں عظیم ساسانی سلطنت عرب شاہسواروں کے گھوڑوں کی دھول میں اپنی صدیوں پرانی عظمت اور شان و شوکت کھو بیٹھا اور ساسانیوں کا ایسے نام و نشان مٹ گیا کہ پھر وہ دوبارہ صفحہ ہستی پر نہ ابھر سکے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے زریں دور (634ء تا 644ء) میں عرب افواج نے ایران پر حملے شروع کئے اور 10 سال کے مختصر عرصے میں لگ بھگ ایران فتح ہو چکا تھا اور اسکی عظمت پارینہ خاک میں مل چکی تھی۔ اور جب 644ء میں عربوں نے کرمان فتح کیا تو جنگ سے قبل کرمان کے بلوچوں نے کوہ قفص میں آباد بلوچوں سے مدد طلب کی اور ساتھ ہی مدد کیلئے مکران سے بھی رجوع کیا لیکن ان کی امداد پہنچنے سے قبل ہی کرمان فتح ہو گیا بعد ازاں مکران بھی فتح ہوا جو

اس وقت سندھیوں کے تصرف میں تھا اور سندھ کے برہمن راجہ کی طرف سے وہاں کا گورنر تھا جسے عربوں نے دریائے نہنگ کے کنارے شکست دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا اور مکران بھی عربوں کے زیر تصرف آیا۔

بعد ازاں بلوچوں نے مشروط طور پر عربوں کی حمایت کی اور عرب افواج میں شامل ہو کر بقیہ ایران کی فتوحات میں حصہ دار بنے۔ اموی دور میں عربوں نے مکران۔ جھالاوان اور سرحان سمیت قندابیل (گنداواہ) کو بھی فتح کر کے اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔

ان کے بعد غزنوی، آل بویہ، اور منگول بھی اس خطے پر قابض رہے مگر بلوچ قوم کو ایرانی زمانہ عروج کے بعد سے جس زوال کا سامنا تھا وہ تاحال جاری تھا۔ منگولوں کے آخری عہد یعنی پندرھویں صدی کے آغاز میں ایک بار پھر بلوچ یکجہتی کیلئے کوشش شروع ہو گئیں اور آخر کار خان میر نصیر خان نوری عہد حکومت 1749ء تا 1794ء نے پیر جمد (ایرانی بلوچستان صحرائے لوط) سے لیکر کوہ سلیمان (ہڑند و داجل) (ڈیرہ غازی خان) اور ہلمند سے لیکر ساحل مکران تک تمام بلوچوں کو ایک بار پھر ایک ہی لڑی میں پرو دیا اور انھیں ایک جغرافیائی وحدت بھی عطا کی۔ انھیں مختلف ریاستی تقسیم یعنی کنفیڈریشنوں سے نجات دیکر ایک ہی سیاسی قصے میں سمو دیا۔ بلوچ یکجہتی اور اتحاد کی جیتی جاگتی تصویر آخری بار نصیر خان نوری کے زمانے میں دیکھی گئی جنھوں نے اصل بلوچ وطن کو اس کے مکمل رقبے یعنی 340.000 مربع میل کے ساتھ بحال کیا۔ بعد ازاں اب تک زوال اور تقسیم کا عمل جاری ہے۔

بلوچ قبائل کی سراوان و خراسان یعنی قندھار سے لیکر کوئٹہ تک زمانہ قدیم میں موجودگی کی ایک واضح مثال تاریخ کے کئی مستند کتب میں موجود ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قندھار کا قدیم نام بلوس (بلوچ) تھا۔ اسے عربی میں بالش یا بلوش یا والش لکھا گیا ہے۔ جبکہ دیگر زبانوں میں اسے واضح طور پر بلوس تحریر کیا گیا ہے۔ طبقات ناصری کا مصنف اسے بلوس Belos تحریر کرتا ہے۔154

مسٹر ایچ۔ جی۔ ریورٹی اسے بالیوس Balyos لکھتا ہے۔155 تی۔ ٹی سرجنٹ بیلش، والش یا والشان لکھتا ہے۔156 جبکہ سیستان نامی قدیم کتاب کہ جسکا مصنف نامعلوم ہے اور جسکی تصحیح ایران کے ملک الشعراء بہار نے کی ہے اسے بلوس لکھتا ہے۔157

راقم الحروف نے 2010 میں ایک تحقیقی مضمون میں اس عنوان پر کافی روشنی ڈالی ہے اور اس ضمن میں مختلف دلائل بھی دیئے ہیں۔ 158

پندرھویں اور سولہویں صدی کے دوران مختلف سیاسی معاشی اور جغرافیائی وجوہات کی بناء پر لاتعداد بلوچ قبائل سندھ، پنجاب، شمالی ہندوستان، وسط ایشیاء، افریقہ اور عرب ممالک کی جانب منتقل ہو گئے۔ جو آج بھی ان ہی علاقوں میں آباد ہیں۔

مندرجہ بالا اوراق میں بلوچوں کے بارے میں ایک طویل بحث کے بعد یہی نتیجہ اخذ کیا گیا کہ بلوچ باہر سے آنے والے آرین، عرب، ساکا، کشان، ہن، سفید ہن، ہندی، تاجک، دراوڑ یا منگول وغیرہ نہیں ہیں بلکہ یہ بحیرہ خزر سے لیکر مکران تک ہزاروں سالوں سے سکونت پذیر ایک آزاد منش قوم ہے جس نے اپنا اصل مسکن کبھی تبدیل نہیں کیا بلکہ اپنی جنگجویانہ فطرت کی وجہ سے دیگر آنے والوں کو اپنے اندر جذب کرتا گیا البتہ خود کسی میں جذب نہ ہوا ہر جگہ اپنی شناخت برقرار رکھی۔

بلوچ کا خمیر اسی دشت لوط، بحیرہ ہیرکانیہ، کوہ قفقس، کرمان، مکران و ساحل مکران، دشت بیلہ، سبزہ زار توران و قیقانان، دشت خرگاہ کا تک و مستونگ، راہ بند بولان اور سرزمین پہلوانان سیستان سے اٹھایا گیا ہے۔

وہ کوئی الگ نسل نہیں ہے بلکہ زمانہ قدیم اور زمانہ ماقبل تاریخ سے یہاں رہنے والے مختلف قبائل ہیں جو آپس میں یگانگت اور بھائی چارے سے رہتے تھے اور جن میں قدیم اشتمالی طرز کا نظام رائج تھا ان کی صنعت و حرفت اور کسب و پیشے یکساں تھے ان کی ایک جیسی ثقافت تھی اور وہ اعلیٰ جمالیاتی ذوق کے مالک تھے (قدیم برتن) اور قدیم بلوچی کشیدہ کاری اسکی عمدہ مثالیں ہیں جن میں اعلیٰ جمالیاتی ذوق کی خود بخود ترجمانی ہوتی ہے۔ ان کا خطہ زمین بہت وسیع تھا اور ان کی تہذیب خوب پھیلی ہوئی تھی جنکے قدیم نشان آج بھی آثار قدیمہ کی شکل میں بلوچستان کے چپے چپے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بالآخر ایک طویل سفر کے بعد آرین حملوں سے قبل انھوں نے ایک قوم کی شکل اختیار کی اور دنیا کا ایک ایسا جغرافیائی خطہ ان کے پاس تھا کہ جہاں مشرق اور مغرب آپس میں گلے ملتے ہیں۔ لہٰذا اس اہم ترین گذرگاہ پر آباد ہونے کی وجہ سے صحرائی اور پہاڑی بے آب و گیا سرزمین کے وارث ہونے کے باوجود دنیا کے دیگر اقوام سے ہمیشہ متاثر ہوتے رہے۔ چونکہ

بلوچستان سے مشرق سے مغرب یا مغرب سے مشرق میں سفر کرنے کیلئے صرف دو ہی راستے ہیں یعنی مولہ اور بولان۔ ان دو اہم ترین دروازوں کے نمیان زمانہ ماقبل تاریخ سے بیرونی حملہ اندازوں، تاجروں، حملہ آوروں اور کاروانوں سے متعارف ہوتے رہے ہیں۔ اکثر دیگر اقوام کے مختصر دستے بھی آ کر ان میں مدغم ہوتے رہے اسی وجہ سے اسے کوئی ایک ہی نسل نہیں کہا جا سکتا البتہ انسانی قومی معاشرتی دھارے میں بلوچ ماقبل تاریخ سے داخل ہو چکا تھا۔

تحریری حقائق جو واضح طور پر بلوچ اصلیت اور قدامت پر روشنی ڈالتے ہیں اور بلوچوں کو ان کی موجودہ زمین پر کہ جو اس وقت تین ممالک میں منقسم ہے، زمانہ قدیم سے آباد ثابت کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ آرین حملوں سے بھی قبل یہاں ان کی موجودگی ثابت ہوتی ہے۔ بے شک وہ بلوچ قوم کے نام سے بعد ازاں جانے گئے مگر ان کی قبائلی حیثیت اور وجود سے کسی طور انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی تحریری تاریخ سے قبل بھی وہ مختلف قبائل کی صورت میں یہاں پھیلے ہوئے تھے اور باقاعدہ ایک منظم اور مربوط طریقے سے زندگی گزار رہے تھے۔ تحریری حقائق کے علاوہ یہاں پھیلے ہوئے مٹی کے ہزاروں قدیم ٹیلے بھی کئی طرح سے اس خطے میں زمانہ ماقبل تاریخ میں بلوچ قبائل کے موجودگی کی گواہی دیتے ہیں۔ گو کہ بلوچستان کے آثار قدیمہ پر تفصیلی کام نہیں ہوا اور ماسوائے چند مشہور مقامات کے زیادہ تر آثار بغیر تحقیق و تفتیش کے پڑے ہیں۔ مگر جن آثار پر کام ہوا ہے وُہ حیرت انگیز طور پر اس جدید دور میں بھی بلوچی تہذیب و ثقافت سے مکمل ہم آہنگی رکھتے ہیں۔ مثلاً

(۱) زمانہ قدیم کے یہ آثار آج بھی جدید دیہاتوں کے قریب قریب پائے جاتے ہیں۔

(۲) ان آثار کی ضخامت سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ زمانہ قدیم کے دیہات ہوتے تھے کہ جو چند گھروں پر مشتمل ہوتے تھے اور وہ یقیناً آپس میں قربت اور رشتہ رکھتے ہوں گے جو وہ یکجا رہتے تھے اور آج بھی بالکل آبادیاں اسی طرح تقسیم ہیں

(۳) چونکہ یہ ٹیلے بلوچستان میں ہزاروں کی تعداد میں اور قریب قریب پائے جاتے ہیں لہٰذا اس سے اس خیال کو اور زیادہ تقویت ملتی ہے کہ

(i) بلوچستان میں ایک عظیم اور وسیع دیہات سسٹم قائم تھا۔

(ii) ہر دیہات کسی برادری، طائفے، خاندان یا قبیلے پر مشتمل ہوتا تھا۔

(۴) اور آج بھی بعینہ یہی طریقہ کار بلوچستان میں رائج ہے کہ تقریباً ہر قبیلہ اپنے مخصوص علاقے میں رہتا ہے اور وہی چھوٹے چھوٹے دیہات آج بھی بلوچستان میں ہر جگہ دیکھے جا سکتے ہیں جو کسی نہ کسی مخصوص قبیلے، طائفے یا پاڑے وغیرہ پر مشتمل ہونگے۔

(۵) جدید ایجادات اور ترقی سے قطع نظر صرف چند سال ماضی میں جھانکا جائے تو جو عکس بلوچستان کا سامنے آتا وہ کچھ یوں ہے کہ

(i) کاریزات، چشموں وغیرہ سے آبپاشی کی جاتی ہے۔

(ii) قدیم طریقے کے مطابق زمین میں ہل جوتا جاتا ہے۔

(iii) قدیم انسانوں کی طرح فصل کاشت کی جاتی ہے۔

(iv) وہی زمانہ قدیم کے مٹی یا تانبے وغیرہ کے برتن استعمال کئے جاتے ہیں۔

(v) تمام تر دستکاری اپنے پرانے اور قدیم خطوط کے مطابق ہوتی ہے۔

(vi) وہی زمانہ قدیم کی طرح رسل ورسائل کے ذرائع ہیں۔

(vii) حتیٰ کہ آج اس جدید دور میں بھی وہی لباس استعمال کی جاتی ہے کہ جو زمانہ قدیم میں لوگ استعمال کرتے تھے۔ اسکی گواہی برتن کا وہ ٹکڑا ہے کہ جو مہرگڑھ کے آثار سے برآمد ہوا جس پر چند خواتین ایک دائرے میں کھڑے ہیں اور ایسے جیسے کہ بلوچی چاپ (رقص) کیلئے خواتین ایک دائرہ بناتے ہیں۔ ان تمام خواتین نے گول فراک نما بلوچی طرز کے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔159

(۶) اسی طرح سواستیکا کے نشان نما کئی اشیاء مثلاً برتن، تعویزات اور مہریں وغیرہ بھی مہرگڑھ سے ملی ہیں۔160 جو روحانی اور مذہبی مقاصد کیلئے استعمال ہوتا تھا۔

(۷) گو ہر طرح سے یہ قدیم آبادیاں بلوچی طرز زندگی کی نمائندگی کرتی ہیں البتہ خصوصی طور پر وہ برتن زیادہ اہمیت کے حامل ہیں کہ جن پر اقلیدسی اشکال بنی ہوئی ہیں۔ اگر ان اشکال اور اقلیدسی (جیومیٹریکل) نشانات کو بغور دیکھا جائے تو وہ ہو بہو بلوچی کشیدہ کی طرح نظر آتی ہیں اور ایسے لگتا ہے کہ جیسے یہی برتنوں کا نقش رنگ وروغن کی بجائے رنگین دھاگوں کے ذریعے کسی کپڑے

پر بنایا گیا ہے۔

حتیٰ کہ ہر طرح سے یہ قدیم آثار قدیم بلوچوں کی آماج گاہیں ثابت ہوتی ہیں کہ جو ہزاروں سال عروج پانے کے بعد آہستہ آہستہ دنیا کے دیگر خطوں سے آنے والے حملہ آوروں کی وجہ سے ویران ہوتے گئے اور مقامی آبادی اس وسیع خطے کے دشت وجبل میں صحرانوردی بھی کرتا رہا اور نئی نئی آبادیاں بھی قائم کرتا رہا۔ اگر بغور دیکھا جائے تو خطہ بلوچستان ساڑھے تین ہزار سال سے پہلے شمال کی طرف سے آنے والی وحشی آریاؤں کے دور سے متاثر ہونا شروع ہوا اور اسکی قدیم آبادیاں ویرانوں میں تبدیل ہوتی گئیں اور یہی وہ قبائل تھے کہ جو تورا کینہ قاضی اور بعض دیگر مؤرخین کے مطابق صدیوں تک آرین حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے رہے۔ اس خطے کے قدیم باشندوں کو دراوڑ کہنا بالکل نامناسب ہے کیونکہ تاریخی حقائق یہ ثابت کرتے ہیں کہ اولاً دراوڑ بھی آرین کی طرح کسی ایک قوم یا قبیلے سے تعلق نہیں رکھتے تھے اور ثانیاً یہ کہ دراوڑ تہذیب یا وادیٔ سندھ کی تہذیب کا آغاز اب تک دریافت شدہ آثار کے مطابق بلوچستان کی تہذیب کے بہت بعد کے زمانوں میں ظہور پذیر ہوئی جبکہ اس وقت بلوچستان کی تہذیب وثقافت اور صنعت وحرفت اپنے عروج پر تھا۔

یقینی بات ہے کہ حملہ آوروں کے ساتھ مزاحمت میں یہاں کے باشندوں کی ایک بڑی تعداد کھیت رہی ہوگی کچھ ان کے ساتھ مل گئے ہونگے یا گرفتار ہو گئے ہونگے اور کچھ فرار ہونے میں کامیاب ہوئے ہونگے مگر بلوچستان کے آثار میں سے اکثر ایسے ٹیلے ہیں کہ جو جلے ہوئے ہیں مگر ان میں ایسے شواہد نہیں ملے کہ جن سے ثابت ہو سکے کہ یہاں پر کوئی بڑی خون ریزی ہوئی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ حملہ آوروں کے آنے سے قبل ہی مقامی آبادی نے پہاڑوں کا رخ کیا ہو اور ان پیچیدہ دروں میں پناہ لی ہو۔ آج بھی بلوچ قبائل پہاڑوں کو شہروں پر ترجیح دیتے ہیں۔ ممکن ہے کہ حملہ آوروں کے جانے کے بعد ان قبائل نے دوبارہ نئے سرے سے اپنی آبادیاں بسائی ہوں ایسے شواہد کثرت کے ساتھ بلوچستان میں ملتے ہیں۔

اب اس میں تو کوئی شک نہیں رہا کہ بلوچ نہ صرف قبل مسیح میں بلوچستان میں موجود تھے بلکہ آرین حملوں سے پیشتر بھی وہ یہاں سکونت رکھتے تھے جنھوں نے آرین کا مقابلہ کر کے سخت نقصان بھی اٹھایا تھا اور ان کی قدیم آبادیاں مٹی کے ڈھیر میں تبدیل ہوتی گئیں جو آج آثار قدیمہ

میں تبدیل ہو کر اپنے اندر ماضی کی تمام داستان پوری سچائی کے ساتھ لیے ایستادہ ہیں۔

کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ:

"بلوچوں کا تعلق اس قدیم تہذیب سے ہو اور بلوچ ان ہی لوگوں سے تعلق رکھتے ہوں جن کی باقیات پورے بلوچستان میں پھیلے ہوئے ہیں اور جو نہ صرف بلوچستانی حدود سے باہر کی آثار قدیمہ سے مختلف ہیں بلکہ حیران کن حد تک ان لوگوں کی طرز معاشرت، برتن سازی اور برتنوں کا استعمال، برتنوں پر پائے جانے والے نقوش اور بلوچی کشیدہ میں حیران کن حد تک مماثلت اور ان کے چھوٹے اور مختصر دیہات، بلوچ معاشرے میں استعمال ہونے والی اشیاء اور دیہات سسٹم کے عین مطابق ہیں اور قدیم نظام اور بلوچی نظام کی یہ حیران کن مماثلت اس قیاس کو اور زیادہ تقویت دیتی ہے کہ کیا بلوچ اسی قدیم تہذیب کے وارث ہیں؟؟؟؟؟" یقیناً اس سوال کا جواب مٹی کے ان ٹیلوں سے ہی ملے گا جو بلوچستان میں دور دور تک پھیلے اور بکھرے ہوئے محققین کے منتظر ہیں۔

خوالہ جات

1. عنایت اللہ بلوچ، دی پرابلم آف گریٹر بلوچستان، اے کیس سٹڈی آف بلوچ نیشنلزم، سی ایم بی ایچ، سٹ گرٹ، جرمنی، 1987، 37-39
2. پروفیسر عزیز احمد، نسل انسانی کی تاریخ، اپنا ادارہ، لاہور، 2000، 19-22
3. ضیاء الدین اکمل، قدیم تاریخ، نئی بک پوائنٹ، کراچی، 2009، 11
4. قرآن مجید، سورہ علق، آیت ۲، پارہ 30
5. محمد سردار خان بلوچ، اے لٹریری ہسٹری آف بلوچیز، بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، 1977ء، 7
6. ڈاکٹر شاہ محمد مری، بلوچ قوم قدیم عہد سے عصرِ حاضر تک، تخلیقات، لاہور، 2000ء، 43
7. محمد سردار خان بلوچ، ہسٹری آف بلوچ ریس، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ، 1958ء، 15-18
8. ایضاً، 17-27
9. عنایت اللہ بلوچ، 41 و محمد سردار خان، بلوچ ریس، 19-18
10. علامہ محمد ابن سعد، طبقات ابن سعد، مترجم: علامہ عبداللہ العماری، نفیس اکیڈمی، کراچی، 1983ء، 61
11. سبط حسن، ماضی کے مزار، مکتبہ دانیال، کراچی، 2002ء، تیرہواں ایڈیشن، 76
12. ایضاً، 76-77
13. کنڈر مین، اٹلس آف ورلڈ ہسٹری، پینگوئن پبلشرز، نیویارک، یو ایس اے، 27
14. ایضاً، 27

15. ایضاً، 27 و سبط حسن، 2002، 29-428

16. سبط حسن، 2002، 397-292

17. کنڈرمین، 27

18. ایضاً، 27

19. ایضاً، 28-27

20. سبط حسن، 2002، 405

21. ایضاً، 109 و کنڈرمین، 29

22. کنڈرمین، 31

23. سبط حسن، 2002، 26-102

24. کنڈرمین، 39

25. گورنمنٹ ریکارڈ، سندھ نگر، مترجم، پروفیسر ایم انور رومان، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ، 1989، 321 و سر مورٹیمر ویلر، انڈس سویلائزیشن، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، 1997، 1

26. ڈاکٹر مظفر حسن ملک، نسلیات پاکستان، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 2003، 27

27. محمد مجیب، دنیا کی قدیم تاریخ، سٹی بک پوائنٹ، کراچی، 2005، 63

28. ڈاکٹر شاہ محمد مری، 48

29. سر مورٹیمر ویلر، وادیٔ سندھ کی تہذیبیں، مترجم: زبیر رضوی، بک ہوم، لاہور، 2003، 6-5

30. محمد مجیب، 62 و سر مورٹیمر ویلر، انڈس سویلائزیشن، 25

31. کندرمین، 43-42

32. ایضاً، 43

33. یحییٰ امجد، تاریخ پاکستان (قدیم دور)، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، 1989ء، 234

34. ڈی۔ڈی کوسمبی، قدیم ہندوستان: تہذیب و تمدن، بک ہوم، لاہور، 2012، 64

35. ہنری پوٹینگر، سفر نامہ سندھ و بلوچستان، مترجم: پروفیسر ایم انور رومان، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ، 1983، 22

ونسنٹ اے سمتھ، قدیم تاریخ ہند، مترجم: محمد جمیل الرحمن، تخلیقات، لاہور، 2001

36. میک کرنڈل، انویژن آف انڈیا بائے الیگزینڈر دی گریٹ، انڈس پبلیکیشنز، کراچی، 126 و میک

ہیرلڈلیم، سکندر اعظم، مترجم: مولانا غلام رسول مہر، فکشن ہاؤس، لاہور، 2006، 1984، 27

سیکنڈ ایڈیشن، 300

37. فاروق بلوچ، دی اوریجن آف دی ورڈ براہوئی، ان دی لائٹ آف ہسٹری، سالیزنہ، سالانہ ریسرچ جرنل، براہوئی ڈیپارٹمنٹ، یونیورسٹی آف بلوچستان، کوئٹہ، والیم 1، 2009، 35-32

38. مولانا رحیم داد شاہوانی، الملقب بہ مولائی شیدائی، تاریخ قلات، بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، 1983ء، 123

39. اعجاز الحق قدوسی، تاریخ سندھ جلد اول، اردو سائنس بورڈ، لاہور، 1976ء، سیکنڈ ایڈیشن، 167

40. مولانا نور احمد فریدی، بلوچ قوم اور اس کی تاریخ، گلگشت کالونی، ملتان، سال ندارد، 150

41. م۔ک پیکولین، بلوچ، مترجم: ڈاکٹر شاہ محمد مری، تخلیقات، لاہور، 2006، 30

42. ایضاً، 32

43. نوراکینہ قاضی، سائرس اعظم، شاہکار بک فاؤنڈیشن، کراچی، سال ندارد، 112

44. میر گل خان نصیر، کوچ و بلوچ، گوشہ ادب، کوئٹہ، 1999، 25-24

45. محمد سعید دہوار، تاریخ بلوچستان، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ، 1990ء، 82

46. کنڈرمین، 113

47. سید ظہور شاہ ہاشمی، بلوچی زبان و ادب کی تاریخ ایک جائزہ، سید ہاشمی اکیڈمی، کراچی، 1986ء، 223

48. جی۔ لی سٹرینج، جغرافیہ خلافت مشرقی، مترجم: محمد جمیل الرحمان، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1986ء، 94-464

49. ایضاً، 502-494

50. میر گل خان نصیر، 1999، 25-24

51. سید ظہور شاہ ہاشمی، 223
52. محمد سعید دہوار، 222-23
53. سید ظہور شاہ ہاشمی، 238
54. جسٹس میر خدا بخش بجارانی مری، سرچ لائٹس آن بلوچز اینڈ بلوچستان، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ، 1985، تیسرا ایڈیشن، 7
55. ایضاً، 7
56. جی پی ٹیٹ، 69
57. میر گل خان نصیر، تاریخ بلوچستان، قلات پبلشرز، کوئٹہ، 2000، 1
58. ایضاً، 2
59. ایضاً، 3
60. ایضاً، 3
61. ایضاً، 4
62. ایضاً، 4
63. ملک صالح محمد لہڑی، بلوچستان ون یونٹ سے پہلے، ہفتہ وار باغ و بہار، کوئٹہ، 1-4-1952
64. پروفیسر محمد اشرف شاہین قیصرانی، بلوچستان تاریخ و مذہب، ادارہ تدریس، کوئٹہ، 1994، 62-67
65. بریگیڈیئر محمد اسماعیل صدیقی، تاریخ بلوچستان، دوست پبلیکیشنز، لاہور، 2008، 136-140
66. سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، مکتبہ دانیال، کراچی، 2002، گیارہواں ایڈیشن، 85
67. جسٹس خدا بخش بجارانی مری، 43,45
68. میر گل خان نصیر، 1999، 24-25
69. ایضاً، 136

70. جسٹس خدا بخش بجارانی مری، بلوچستان تاریخ کے آئینے میں، مترجم: سعید احمد رفیق، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ، 1989، تھرڈ ایڈیشن، 76
71. آغا نصیر خان احمد زئی کمبرانی، تاریخ بلوچ و بلوچستان (جلد دوئم)، بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، 1982ء، 140
72. ایضاً، 140
73. ایضاً، 142
74. جسٹس خدا بخش بجارانی مری (اردو ترجمہ)، 76-79
75. ایضاً، 63-66
76. سید ظہور شاہ ہاشمی، 180-84
77. میر گل خان نصیر، 1999ء، 24,25
78. جی پی سٹریٹج، 464-502 و عبدالرحمن ابن خلدون، تاریخ ابن خلدون (جلد ششم)، نفیس اکیڈمی، کراچی، 1971ء، 227
79. ایضاً، 227-28
80. محمد سعید دہوار، 279
81. اعجاز الحق قدوسی، جلد اول، 331
82. عبدالرحمن ابن خلدون، جلد ششم، 351-52
83. پروفیسر عزیز الدین، کیا ہم اکٹھے رہ سکتے ہیں، مکتبہ فکر و دانش، لاہور، 1992 سیکنڈ ایڈیشن، 60
84. ہیروڈوٹس، دنیا کی قدیم تاریخ، مترجم: یاسر جواد، نگارشات، لاہور، 507-12
85. سمتھ، 126
86. ایضاً، 126
87. ایضاً، 126
88. دہوار، 1990، 173
89. مولائی گیدائی (1983)، 123

90. سمتھ، 127

91. علامہ محمد ابن سعد، 65

92. ہیروڈوٹس، 260,61

93. کوبسی، 85-86

94. مولانا ابو الکلام آزاد، اصحاب کہف اور یاجوج ماجوج۔ مکتبہ جمال، لاہور، 2012، 41,42,51.52

95. محمد سعید دہوار، 170-71

96. قرآن مجید، سورہ کہف، آیات 83 تا 98

97. مولانا ابوالکلام آزاد، 47-67

98. مولانا ابوالکلام آزاد، 42

99. کوبسی، 109

100. ایضاً، 106

101. ایضاً، 110

102. عزیز اللہ عزیز براوی، ماہنامہ اولس، کوئٹہ/اسلام آباد، مارچ، اپریل، 1986، 25

103. سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء 85

104. محمد سردار خان بلوچ، 1977، 463-68

105. عبداللہ ملک، تاریخ اسلام، قریشی برادرز، لاہور، 2011، 450

106. علامہ شبلی نعمانی، الفاروق، پرویز بک ڈپو، دہلی، سال ندارد، 157

107. (تصحیح کنندہ) ملک الشعراء بہار، تاریخ سیستان (اصل مؤرخ نا معلوم)، مطبوعہ دولتی، تہران، ایران، 1366ھ، 401، 316، 213، 86

108. جی پی ٹیٹ، 485-86

109. مولانا نور احمد فریدی، 206-18

110. سید ظہور شاہ ہاشمی، 172-79

111. ڈاکٹر شاہ محمد مری، 43

112. سید ظہور شاہ ہاشمی، 238

113. تورا کینہ قاضی، 52

114. ایضاً، 6

115. سبط حسن، موسیٰ سے مارکس تک، دانیال پبلشرز، کراچی، 2009، چھٹا ایڈیشن، 21-22

116. میر احمد یار خان، تاریخ خوانین بلوچ، اسلامیہ پریس، کوئٹہ، 1974، 9

117. اعجاز الحق قدوسی، جلد دوئم، 385

118. جی پی ٹیٹ، دی کنگڈم آف افغانستان، انڈس پبلیکیشنز، کراچی، 1973، 68

119. پیر کرم شاہ الازہری، ضیاء النبی، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، 1415ھ، 67

120. ایضاً، 67

121. ایضاً، 67-68

122. ایضاً، 68

123. علامہ محمد ابن سعد، جلد اول، 71-72

124. پیر کرم شاہ الازہری، 68-69

125. پیر کرم شاہ الازہری، 69-70

126. سید ظہور شاہ ہاشمی، 28

127. جسٹس خدا بخش بجارانی، (انگریزی)، 13

128. مولانا نور احمد فریدی، 67

129. پیر کرم شاہ الازہری، 71

130. مولانا نور احمد فریدی، 68

131. ایضاً، 71

132. سید ظہور شاہ ہاشمی، 63

133. سبط حسن پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، 85

134. محمد سعید دہوار، اسے دریائے حب، جبکہ میکرنڈل، سمتھ، ہیرلڈ لیم اور بعض دیگر اسے

پورالی سے تشبیہ دیتے ہیں اور یہی درست ہے۔

135. ونسنٹ اے سمتھ، 142، 126

136. ایضاً، 127

137. ایضاً، 126

138. میک کرنڈل، 3، وسمتھ 28-127

139. جی پی ٹیٹ، 501-482

140. توراکینہ قاضی، 89

141. ایضاً، 94-93

142. ایضاً، 112

143. ایضاً، 143

144. سید ظہور شاہ ہاشمی، 194 و جسٹس خدا بخش بجارانی مری، (انگریزی)، 40

145. توراکینہ قاضی، 267

146. جی پی ٹیٹ، 95-494

147. ہیرلڈلیم 303-303

148. توراکینہ قاضی، 206

149. ایضاً، 304

150. ایضاً، 42-141

151. مولانا منہاج الدین سراج، ابوعمر عثمان، طبقات ناصری، مترجم (انگریزی) میجر ایچ جی ریورٹی، دی ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ، 1995 ری پرنٹ، 95-194

152. محمد سعید دہوار، 71-170

153. توراکینہ قاضی، 274،

154. مولانا منہاج الدین سراج، (جلد دوئم انگریزی ترجمہ)، 8، 101، 319

155. ایچ۔ جی ریورٹی، سرزمین افغان و بلوچ، اردو ترجمہ: پروفیسر سعید احمد خالد، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ، 1999، 02-801

156. جی پی ٹیٹ، 01-501، (نقشہ 85-484)

157. ملک الشعراء بہار، 31-29

158. فاروق بلوچ، بالس، آر بیلوس، دی اینشنٹ نیم آف کوئٹہ کم قندھار، بلوچستان ریویو (جرنل) بلوچستان سٹڈی سینٹر، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ، والیم XXIII، نمبر 1، 2010، 26-22

159. جیرج، جین فرانکوئیس، مہرگڑھ ایکسکویشن رپورٹ فرام 1974 ٹو 1985، پی ٹی ڈی سی، گورنمنٹ آف سندھ اینڈ فرنچ ایمبیسی، کراچی، 1986

باب دوئم

بلوچ وطن

سیماب طبیعت سیاسی اور جغرافیائی تغیرات کی سرزمین بلوچستان، ہندوستان، افغانستان اور ایران کے نکڑ پر واقع ہے جس کے جنوب میں بحیرہ بلوچ کا طویل ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے بلوچستان کی جغرافیائی کیفیت زمانہ قدیم سے تبدیل ہوتی رہی ہے جو ہمیشہ اپنے وقت اور زمانے کے سپر پاورز کیلئے زبردست جغرافیائی اور علاقائی اہمیت کی وجہ سے قابل توجہ رہی ہے۔ بلوچستان میں عظیم طاقتوں کی دلچسپی ہی سے بلوچستان کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

موجودہ دور میں بھی بلوچستان تین مختلف ممالک کے زیر اثر ہے اور ان ممالک نے اندرونی طور پر بھی اسے حصوں بخروں میں بانٹ رکھا ہے۔ شکار پور، جیکب آباد اور کراچی جو کبھی بلوچستان کا حصہ تھے سندھ میں جبکہ ڈیرہ غازی خان اور راجن پور سمیت بلوچ علاقہ پنجاب میں شامل ہیں۔ بلوچستان کے جغرافیہ اور سرحدوں کے بارے میں ہمیشہ تضادات اور تنازعات پیدا ہوتے رہے ہیں لیکن اس تغیر کو جو ہونا تھا کوئی تضاد یا تنازعہ روک نہیں سکا۔ یہی وجہ ہے کہ بلوچستان اپنے باسیوں کی طرح نہ صرف تقسیم ہے بلکہ ہر حصہ اپنی جگہ شدید قومی، سیاسی، معاشی اور جغرافیائی بحران کا شکار ہے۔

مختلف مؤرخین نے بلوچستان کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے بلوچستان کے بارے میں اپنی کتابیں شائع کی ہیں لیکن ہر مورخ اس ضمن میں دوسرے مورخ سے اختلاف رکھتا ہے جس طرح ان کی نسلی اصلیت کے بارے میں مؤرخین میں اختلافات ہیں اسی طرح بلوچستان کا جغرافیہ بھی صحیح طرح سے کسی نے بیان نہیں کیا البتہ 1933 میں انجمن اتحاد بلوچاں کے جنرل سیکرٹری میر عبد

العزیز کرد نے جو نقشہ پیش کیا تھا وہ کسی حد تک درست تھا مگر افسوس اس نقشے کو اکا دکا بلوچ رہنماؤں کے علاوہ کسی نے اہمیت نہیں دی البتہ موجودہ دور میں تعلیم یافتہ نوجوانوں میں وہ نقشہ بہت مقبول ہو رہا ہے اور اسکی زبردست حمایت بھی کی جا رہی ہے۔ مؤرخین بلوچستان کے جغرافیائی کیفیت کے بارے میں مختلف نظریات کے حامل ہیں اس سلسلے میں لارڈ کرزن لکھتے ہیں کہ:

یہ علاقہ بلمند اور بحیرہ عرب (ساحل مکران) اور سندھ کے درمیان واقع ہے افغانستان میں بلمند کا ایک حصہ یعنی فراح، چکنسور اور گرم سیل کے علاوہ شوراک اور ہرات میں بادغیس تک بلوچ علاقہ ہے۔ 1

محمد سردار خان کی رائے میں:

اگر ایک لائن روس کی سرحد پر سرخس سے گمبد مشہد اور پھر سیدھی بمپور، رامیش اور پھر بندر عباس تک کھینچی جائے تو اس لائن کے مشرق میں افغانستان اور ایران کی حدود کو چھوتا ہوا تمام علاقہ بلوچ علاقہ ہے اور اسکا کل رقبہ 3.40.000 مربع میل ہے۔ 2

اس ضمن میں جسٹس میر خدا بخش بجارانی مری رقم طراز ہے کہ:

اگر ہم بحیرہ عرب میں بندر عباس سے شمال میں کرمان کی طرف ایک لائن کھینچیں اور شمال میں ایران کے علاقے نہہ کی طرف بڑھیں اور افغانی سیستان میں فراح کی طرف مشرق میں آئیں اور اسکے بعد مشرق میں گریشک تک بڑھیں اور وہاں سے پاکستان میں بلوچستان کی حد پر باران خان کے گاؤں تک آئیں بعد ازیں بلوچستان کے شمالی علاقہ میں سے ہوتے ہوئے مظفر گڑھ اور ڈیرہ غازی خان کے ضلعوں تک بڑھیں اور پھر وہاں سے جیکب آباد لاڑکانہ کی جنوب مشرقی سرحد اور سکھر اور دادو اضلاع کے شمال تک آئیں اس کے بعد مغرب کی طرف مڑیں اور بحیرہ عرب میں کراچی کے قریب بلوچستان کے ضلع لسبیلہ کی سرحد تک پہنچ جائیں یہ مذکورہ بالا علاقہ بلوچستان کی حدود ہوں گی اور اس کا کل رقبہ 2.50.000 مربع میل ہوگا۔ 3

اسی حوالے سے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا بیان کچھ یوں ہے۔

شمالی مشرق میں دریائے گومل سے لیکر جنوب میں بحیرہ عرب (ساحل مکران) مغرب اور شمال مغرب میں ایرانی اور افغانستانی سرحدات سے مشرق میں کوہ سلیمان کوہ کیرتھر کی پہاڑیوں تک جبکہ جنوبی ساحل، ساحل مکران کہلاتا ہے یہ سارے علاقے بلوچستان کے ہیں۔ 4 مگر اس میں

ایرانی بلوچستان کے علاقے شامل نہیں۔

جان محمد دشتی بلوچ خطے کے بارے میں لکھتا ہے کہ:

"بلوچ پاکستان، ایران اور افغانستان میں آباد ہیں بلوچ خطہ اور آبادی ان تین ہمسایوں میں منقسم ہے ایران میں بلوچ مند سے کرمان تک پھیلے ہوئے ہیں جبکہ نیچے کی جانب 400 میل طویل ساحل سمندر جو بندر عباس سے جیونی تک ہے اسی حصے میں ہے اور جیونی سے کراچی تک تقریباً 350 میل طویل ساحل پاکستان کے ساتھ ہے شمال مشرق میں بلمند اور سیستان اور وہاں سے زابل تک سارا بلوچ علاقہ ہے" ۔ 5

اکثر و بیشتر مؤرخین بلوچستان کا کل رقبہ لکھنے سے اعتراز کرتے ہیں کیونکہ بدقسمتی سے یہ خطہ مختلف ممالک میں منقسم ہے لہٰذا جب رقبہ لکھا جاتا ہے تو اس وقت یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ کس حصے کا رقبہ لکھا جائے مگر مؤرخین میں سے بعض 3.40.000 مربع میل کے رقبے پر متفق ہیں اس ضمن میں عنایت اللہ بلوچ رقم طراز ہے کہ:

بلوچستان جو سیاسی طور پر تین مختلف ممالک میں منقسم ہے ساخت کے لحاظ بنیادی طور پر ایک ہی زمین ہے جسکا کل رقبہ 3.40.000 مربع میل ہے جو بیشتر یورپی ممالک سے رقبے کے لحاظ سے بڑا ہے۔ 6

غرضیکہ بعض مؤرخین 3.40.000 مربع میل کے رقبے پر متفق ہیں مگر یہ بلوچ سرزمین کا سیاسی نقشہ ہوگا جبکہ بلوچ اس سے زیادہ وسیع رقبے پر آباد ہیں بلوچ خوانین قلات میں میر نصیر خان نوری بلوچ سرزمین کا صحیح ادراک رکھتے تھے یہی وجہ تھی کہ وہ نہ صرف بلوچ خطے کے اتحاد اور یکجہتی کیلئے سب سے زیادہ سرگرم رہے اور انہی نقوش پر بلوچستان کی جغرافیائی بنیادیں استوار کیں جہاں زمانہ قدیم سے اس کے آباؤ اجداد آباد رہتے چلے آرہے تھے مگر وسائل کی کمی اور دیگر نامساعد حالات کے سبب وہ بھی بیشتر بلوچ علاقہ جو شمالی اور شمال مشرقی ایران میں تھا کو اپنی عظیم الشان مملکت میں شامل نہ کرسکے البتہ ان کی بلوچ خطے کو متحد کرنے کے جذبات کا اندازہ ان الفاظ سے لگایا جاسکتا ہے کہ پنجاب کی مہمات کے دوران افغان حکمران احمد شاہ ابدالی نے میر نصیر خان نوری حاکم بلوچستان سے ان کی مملکت کے حدود کے بارے میں دریافت کیا تو میر نصیر خان نوری نے برملا اور واضح الفاظ میں کہا:۔

جہاں تک بلوچی بولی جاتی ہے وہاں تک بلوچستان کے حدود ہیں"۔7

بلوچستان کے جغرافیہ کے بارے میں ان تضادات اور بیانات میں اختلافات کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ زمانہ قدیم سے بڑی طاقتیں بلوچستان کی جغرافیائی اتحاد اور قومی یکجہتی کو اپنی بقاء کیلئے خطرہ سمجھتے چلے آرہے ہیں کیونکہ بلوچستان میں مداخلت صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ اسے جغرافیائی اور قومی سطح پر تقسیم کیا جائے لہٰذا یہ فارمولہ ماضی قدیم سے بڑی طاقتیں آزماتے چلے آرہے ہیں۔اس خطہ زمین کی بیشتر آبادی بلوچوں پر مشتمل ہے جو زمانہ قدیم سے ہی اپنے مساکن اور جغرافیائی حدود کے اندر قبائلی تحفظات کے تحت مختلف کنفیڈریشن میں زندگی گذارتے چلے آرہے ہیں اور جب بھی تاریخ میں کبھی بلوچستان کے یہ مختلف قبائلی خطے اتحاد کی طرف بڑھے تو دور ونزدیک کے طاقتور ہمسایوں نے ان کے اتحاد کو سبوتاژ کیا اور ان کے اتحاد کی راہ میں دشواریاں اور رکاوٹیں کھڑی کیں لہٰذا بلوچ خطہ زمین تاریخ میں کئی بار متحد ہوا اور ہر بار طاقتور قوتوں نے اسے ٹکڑوں میں بانٹ دیا۔ یہ فیصلہ کرتے ہوئے کبھی بلوچوں کی رضامندی کو درغور اعتنا نہیں سمجھا گیا۔یہی وجہ ہے کہ بلوچ جغرافیہ بیان کرتے ہوئے مؤرخین اختلافات کا شکار ہو جاتے ہیں۔

چونکہ بلوچستان ماضی قدیم میں مختلف ولایتوں میں منقسم رہا اور لفظ بلوچستان کا استعمال بہت بعد میں ہوا البتہ لفظ بلوچ اور ان کے قبائل کے نام زمانہ قدیم سے مروج تھے۔رہا یہ سوال کہ لفظ بلوچستان کا استعمال سب سے پہلے کب اور کس نے کیا تو اس میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ کچھ مؤرخین لکھتے ہیں کہ ابن حوقل نے سب سے پہلے اپنی تصنیف صوۃ الارض میں بلوچستان کا استعمال کیا۔8 مگر ابن حوقل کے مذکورہ تصنیف میں یہ الفاظ نہیں ملتے۔لفظ بلوچستان کے استعمال کے بارے میں ایک خیال یہ بھی ہے کہ میر نصیر خان نوری اور احمد شاہ ابدالی کے مابین طے پانے والے معاہدہ قلات 1758ء کے بعد خطے کو بلوچستان کہا جانے لگا علاوہ ازیں تزک بابری کے اردو ترجمے میں رشید اختر ندوی لفظ بلوچستان کا استعمال کرتا ہے جو کہ سولہویں صدی عیسوی کی تحریر ہے۔9

بہر حال بلوچستان نے یہ نام جب بھی پایا ہو یہ ہمیشہ بلوچوں کے ہی زیر سکونت رہا۔ماضی قدیم سے دور جدید تک کی بلوچستان کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ آرین حملوں سے دور جدید تک جتنے بھی

درانداز اور حملہ آور خطے میں آئے وہ زیادہ عرصہ تک یہاں جم نہ سکے اور زود یا بدیر انھیں یہ خطہ چھوڑ کر سرسبز وشاداب میدانوں اور زیادہ دولتمند خطوں کی طرف جانا پڑا اور اس کے علاوہ جو بھی اس خطے میں آیا اس کا واسطہ بلوچوں سے ہی پڑا۔اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا البتہ بلوچ قبائل قبائلی تحفظات کے طور پر مختلف اتحادیوں کی صورت میں رہتے تھے۔اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ اتحادیے یا کنفیڈریشن کون کون سے تھے جن پر بلوچ اقتدار قائم تھا اور جہاں صدیوں سے ہی یہ قوم ایک تہذیب وتمدن کے تحت زندگی گزارتی چلی آرہی تھی تو ان کنفیڈریشنوں کا ذکر پچھلے صفحات میں ہو چکا ہے۔اس باب میں اگلے سطور میں ان کنفیڈریشنوں کا تفصیلی ذکر کیا جائیگا البتہ یہاں مختصراً ان خطوں کو واضع کیا جا رہا ہے جہاں آرین حملوں سے قبل بلوچ قبائل سکونت پذیر تھے 1600 ق م اور اس سے قبل بلوچ سماج کے خدوخال بحیرہ ہیرکانیہ سے لیکر جنوب میں بحیرہ بلوچ (ساحل مکران) تک اور شرقاً غرباً بولان وجھالاوان سے کرمان کے حدود تک واضع نظر آتے ہیں۔اس پورے خطے کو بلوچ قبائل نے مختلف ولایتوں میں تقسیم کرکے انتظامی آسانی پیدا کردی تھی۔ کیونکہ بلوچستان ایک تو قبائلی سماج کے زیر اثر تھا اور دوئم ایک قدیمی گذرگاہ بھی تھی لہٰذا اس وسیع وعریض خطے کو اتنے ماضی میں ایک مرکز کے تحت منظم کرنا ممکن نہیں تھا لہٰذا ایران کے شمال اور قدرے شمال میں بحیرہ ہیرکانیہ، کوہ البرز، ایلان، گیلان، مازندران اور بالائی جانب شمال مشرق کی طرف دشت لوط کا کچھ حصہ ہیرکانی کنفیڈریشن کہلاتا تھا یہاں چھٹی صدی ق م میں پارتھی آرین خاندان نے بالادستی حاصل کی جو بعد ازاں تیسری صدی ق م میں پورے ایران کے حکمران بنے۔ ہیرکانی کنفیڈریشن سے متصل ناہروئی بلوچوں کا علاقہ تھا جس میں سیستان، خراسان حتیٰ کہ موجودہ چاغی وخاران تک کا علاقہ اور دشت لوط کا علاقہ اس میں شامل تھا ناہروئی کنفیڈریسی کے مغرب میں کرمان بلوچوں کا علاقہ تھا جسمیں کرمان، دشت لوط کا کچھ حصہ اور قفص کی پہاڑیاں شامل تھیں۔ یہ ایک مستحکم علاقہ اور کنفیڈریسی تھی جبکہ ناہروئی کنفیڈریسی کے جنوب اور جنوب مشرق میں مکران اور بیلہ کا علاقہ تھا جو اور یتائی اور گیدروزیائی بلوچ قبائل کے زیر اثر تھا گوکہ ان قبائل کو یہ نام یونانیوں نے دیئے مگر یقیناً ان کے اپنے قبائلی نام بھی ہونگے جو تاریخ میں رقم نہ ہو سکے البتہ ہیرڈوٹس نے مکران کے کچھ قبائل کا تذکرہ کیا ہے یہ یقیناً انہی قبائل سے تعلق رکھتے تھے جنھیں سکندر اور اسکے فوجیوں نے علاقوں کی مناسبت سے نام دیئے اور علاقوں کو بھی خود سے نام عطاء کئے۔

مکران سے شمال اور شمال مشرق میں متصل قیقانان (قلات) کا علاقہ تھا اس میں خضدار کے جنوبی اور اس سے متصل علاقے بھی شامل تھے۔ یہ اہم ترین علاقے تھے جو عین اس عظیم شاہراہ کے کنارے آباد تھے جو وسط ایشیاء، ایران، افغانستان سے سیدھے ساحل سمندر تک جاتی تھی آج بھی وہی شاہراہ وسط ایشیاء سے گوادر اور کراچی کے ساحل تک بطور گذرگاہ استعمال ہوتی ہے۔ لہٰذا خضدار اور قلات یعنی جھالاوان اور سراوان پر ہمیشہ ہمسایہ تہذیب کی دراندازی معمول کی بات تھی۔ چونکہ سراوان اور جھالاوان میں صرف دو ہی راستے ہیں جن سے ہندوستان کی سرزمین میں داخل ہوا جا سکتا ہے یعنی سراوان میں بولان کا درہ اور جھالاوان میں درہ مولہ۔ یہی وجہ تھی کہ ماضی کا ہر حملہ آور انہی راستوں پر قبضہ کرنے کی خواہش رکھتا تھا اور اکثر و بیشتر بلوچستان کے یہ حصے بھی بیرونی تاخت و تاراج کا نشانہ بنتے رہتے تھے۔ وہ علاقے جو آرین حملوں سے قبل بلوچ قبائل کے زیر اثر تھے، کو نقشہ نمبر 1 میں واضح کیا گیا ہے۔

نقشہ نمبر 1 میں ایران میں قائم ہونے والی پہلی حکومت (پیشدادی) کے دور کو دکھایا گیا ہے

تاریخ اس ضمن میں زیادہ معلومات فراہم نہیں کرتی کہ پیش دادی کون تھے؟ اور انھوں نے ایران میں اپنی حکومت کا آغاز کب کیا؟ آغا نصیر خان احمد زئی کمبرانی پیش دادی حکومت کا آغاز 2100 ق م لکھتا ہے۔ 10 پیش دادیوں کے دور میں بلوچ بحیرہ ہیرکانیہ (Caspian Sea) کے ساحلی علاقوں، اس سے متصل پہاڑی سلسلے کوالبرز، مازندران، ایلان، گیلان، تبریز، ترکمانستان کے علاوہ پورے دشت لوط اور صحرائے کرمان، کرمان شہر اور اس سے متصل پہاڑوں (کوہ قفص) میں آباد تھے اس کے علاوہ مکران سیستان، خراسان، سراوان جھالاوان اور وسطی بلوچستان میں بھی سکونت رکھتے تھے جسطرح کہ نقشہ نمبر 1 میں دکھایا گیا ہے اس زمانے میں بلوچوں کو حکومت اور جہانبانی کا کوئی شعور نہ تھا۔ اور وہ اپنے اپنے قبائل تک محدود تھے۔ وہ دور دراز پہاڑی وادیوں، ریگزاروں اور میدانوں میں آباد تھے۔ پیش دادیوں کے اقتدار کا خاتمہ آریائی میدیوں نے 854 ق م میں کیا اور اس طرح ایران پر میدیوں کی حکومت قائم ہوگئی۔ میدی آریائی النسل تھے جن کے بلوچ قبائل کے ساتھ صدیوں تک جنگیں ہوتی رہیں۔ 1600 ق م میں ایران پر حملہ کرنے والے آرین بالآخر 854 ق م میں ایران پر قابض ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ تاریخ کے صفحات واضح طور پر اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ جب ایران پر آریائی حملے شروع ہوئے تو سب سے پہلے ان کی مدمقابل ہیرکانی اور ناروئی بلوچ آئے جنکے ساتھ ان کی خونی چپقلش شروع ہوئی۔ صدیوں بعد بالآخر آرین ان قبائل کو کچلنے میں کامیاب ہوگئے میدیوں Madians کے دور میں بھی بلوچ کنفیڈریشنوں کی صورت اور خدوخال یہی رہی اور بلوچ قبائل اپنے اندرونی اور بیرونی معاملات میں آزاد اور خود مختار رہے۔ میدیوں نے بلوچوں کے ہیرکانی و کرمانی قبائل کی ایک بڑی تعداد کو اپنی فوج میں لے لیا۔ میدیوں کے دور میں بلوچستان کے سراوان و جھالاوان کے علاقے تورانی ترکمانوں کے قبضے میں تھے اس دور میں بلوچ قبائل بقول فردوسی سراوان اور درہ بولان تک آباد تھے اور یہاں کے قدیم باشندے تھے۔ لکھتا ہے کہ نزدیک

زابل بہ سی روزہ راہ — یکے کوہ بود سر کشیدہ بہ ماہ
بہ یک سوئے او دشت خرگاہ بود — دگر دشت زاں ہندرا راہ بود
نشتند درآں دشت بسیار کوچ — زاوگان ولاچین و کرد و بلوچ 11

میدیوں کا پہلا حکمران کیقباد تھا ابوالقاسم کے شاہنامہ فردوسی کے مطابق بلوچ کیقباد کی فوج

میں بڑی تعداد میں شامل ہو گئے۔ یہ وہی بلوچ تھے جو کئی صدیوں تک انہی میدیوں سے ایران کا دفاع کرتے رہے تھے۔ میدیوں کی افرادی قوت اور مسلسل کمک نے بالآخر بلوچوں کو شکست قبول کرنے پر مجبور کیا۔ میدیوں کی فوج میں شامل ہونیکا مقصد اپنا قومی اور علاقائی دفاع کرنا تھا۔ میدیوں نے ان کی بہادری، حوصلہ، جرات مندی اور جذبہ وجہد تسلسل کو اچھی طرح سے دیکھا تھا۔ لہذا کیقباد جیسے ایک جہاندیدہ بادشاہ اور جرنیل نے انھیں خوش آمدید کہا اور فوج کا بہترین دستہ ہیرکانی اور کرمانی بلوچوں سے ترتیب دیا۔

558ق م میں آریاؤں کے ایک اور دھڑے ہخامنشی نے ہیرکانی، کرمانی اور ناہروئی بلوچ قبائل اور دیگر بے شمار صحرائی و پہاڑی قبائل کی مدد سے میدیوں کی حکومت کا خاتمہ کیا اور ایرانی تاج وتخت پر سائرس کا قبضہ ہوا۔ سائرس نے بھی بلوچ قبائل کی ایک بڑی تعداد کو اپنی فوج میں جگہ دی اور انھیں اعلیٰ عہدے دیئے اور اس کے علاوہ جو بلوچ میدی فوج میں تھے انھیں بدستور فوج میں برقرار رکھا لیکن اس کے باوجود وہ بھی ان تمام منتشر بلوچ علاقوں کو وحدت دینے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

ایران پر سائرس کے قبضے کو تورانی حکمران افراسیاب نے قبول نہیں کیا کیونکہ تورانی اور میدی قریبی رشتہ دار تھے لہذا تورانیوں اور ہخامنشی حکمرانوں کے درمیان ایک لمبی اور طویل جنگ کا آغاز ہوا۔ جسکے نتیجے میں افراسیاب اور تورانی فوج کو شکست ہوئی اور توران پر ہخامنشی خاندان کا قبضہ ہوا۔ بقول فردوسی کے افراسیاب کی فوج میں بھی بلوچوں کی ایک کثیر تعداد شامل تھی جو گک کوہزاد کی کمان میں ہخامنشیوں کے سیستانی ناہروئی دستے کے ساتھ نبرد آزما ہوئے۔ سراوانی وجھالاوانی قبائل بلوچ تھے جو مولہ اور بولان کے دروں کے نگہبان تھے۔ اس طرح بلوچوں کا وہ خطہ جو توران کے قبضے میں تھا ایک ہی مملکت کے زیر اثر آیا اور بلوچ کنفیڈریشن میں شامل دیگر حصوں سے تورانی بلوچوں کا رابطہ ہوا اور ان کے قومی ارتقاء، یکجہتی اور جغرافیائی وحدت کیلئے ایک اہم قدم ثابت ہوا۔ ہخامنشیوں نے ایک اقدام یہ کیا کہ جز وقتی طور پر تورانی بلوچ خطے کو مکران میں شامل کیا۔

ہخامنشی دور میں سائرس اور اس کے جانشینوں نے آہستہ آہستہ مشرق مغرب اور شمال کی جانب اپنی ترکتازیاں تیز کر دیں اور زرکسیز اول نے 484ق م کے لگ بھگ مکران جو اسکی سلطنت میں شامل تھا وہاں سے ایک فوج ترتیب دیکر یونان پر حملہ آور ہوا۔12

اسی طرح سیستان کا ناہروئی خطہ بھی ہخامنشیوں کے قبضہ میں چلا گیا بعد ازاں اسی دستے نے تورانی سلطنت پر حملہ کیا۔ ہخامنشیوں کے دور میں بلوچوں کی الگ الگ قائم کنفیڈریشنوں کو ایران کی مرکز کے تحت متحد ہونے کا موقع ملا مگر بقول تورا کینہ قاضی سینکڑوں قبائل ابھی بھی ایسے تھے کہ جنکا نہ تو سائرس کو علم تھا اور نہ ہی ان پر کوئی قابض ہو سکا تھا۔ ہخامنشی اقتدار کیلئے بلوچ قبائل ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے اور تمام تر فوجی اور سیاسی معاملات میں ان کی مداخلت مسلم تھی۔ ہخامنشی فرمانروا بھی ان کی مضبوط افرادی اور فوجی قوت سے آگاہ تھے۔ لہذا ان کا رویہ بھی ان آزاد منش قبائل کے ساتھ روادارانہ تھا اور اس خاندان کے حکمرانوں نے بھی ان کے ساتھ خوشگوار تعلقات وابستہ کئے اور ان سے روادارانہ سلوک کر کے ان کی تمام تر وفاداریاں اور خدمات حاصل کر کے اپنے اقتدار کو تقویت اور طول دیتے رہے۔

ہخامنشی اقتدار میں چونکہ بلوچ کنفیڈریشن ایرانی سلطنت میں مدغم ہو چکی تھیں لیکن ان کی الگ اور خود مختار حیثیت کو ایرانی حکومت نے بھی چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔ لہذا اس دور میں بھی بلوچ مندرجہ بالا نقشے میں دیئے گئے علاقوں میں آباد تھے البتہ ان کی نئی نوآبادیات اور ترکتازیاں وسط ایشیاء، یورپ اور مشرق وسطیٰ کی طرف قائم ہو رہی تھیں۔ کرد بلوچ اور دیگر کئی اقوام وسط ایشیاء، یورپ اور مشرق وسطیٰ میں اپنی نوآبادیاں قائم کرنے لگے کیونکہ کرد بلوچوں اور دیگر کئی وسط ایشیائی اقوام بھی اب سائرس کی فوج میں شامل ہو چکے تھے اور انھوں نے بھی ہخامنشی اقتدار اور بالادستی کو تسلیم کر لیا تھا۔13

ہخامنشیوں کے بعد 330ق م میں مقدونیہ کے شہزادے سکندر نے ایران پر قبضہ کر کے اسے اپنی یونانی سلطنت میں شامل کر لیا ساتھ ہی وسط ایشیاء اور بلوچستان پر بھی اسکا قبضہ ہو گیا جبکہ شمالی ہندوستان میں دریائے بیاس تک کی سرزمین کو اس نے اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔14 ایران اور اس کے اتحادیوں کیلئے یونانی قبضہ دور ابتلا ثابت ہوا اور 100 سالوں تک مختلف صورتوں میں یہ قبضہ برقرار رہا۔ سکندر 323ق م میں فوت ہوا تو اس کے جرنیل آپس میں مقبوضہ علاقوں پر تسلط جمانے کی خاطر لڑ پڑے اور آخرکار تمام بلوچ سرزمین بمعہ ایران، وسط ایشیاء اور ہندوستانی مقبوضات سکندر کے مایہ ناز جرنیل سلیوکس نکوٹار کے قبضے میں آ گئے۔ لیکن جلد ہی یعنی 305ق م میں ہندوستا

ن کی نئی ابھرتی ہوئی طاقت چندر گپت موریا نے اسے ایک شدید جنگ میں شکست دی اور افغانستان سمیت بلوچستان کے ایک وسیع حصہ پر قبضہ کرلیا۔15 بلوچستان کے وہ حصے جواب ایران کے پاس ہیں وہ سیلوکس نکوٹار کے پاس رہے جبکہ باقی ماندہ بلوچ خطہ چندر گپت موریا کے قبضے میں چلا گیا۔اس طرح ایک بار پھر بلوچ خطہ جو ہخامنشی دور میں متحد ہو چکا تھا تقسیم ہوا۔تاریخ کے زریں صفحات اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ بلوچوں نے یونانیوں کو اپنے خطے سے نکالنے کیلئے اپنی حیثیت سے بڑھ کر کوششیں کیں آخر کار ہیرکانی بلوچوں نے پارتھی آریائی اقوام کے ساتھ ملکر یونانیوں کے اقتدار کا خاتمہ کیا اور ایران کو ان کے تسلط سے آزادی ملی۔اس جدوجہد آزادی میں ناہروئی، کرمانی اور مکران کے بلوچ قبائل بھی ان کے ساتھ شامل رہے۔اس کے بعد ایران پارتھیوں کے زیر اقتدار آیا اور ایرانی بلوچ خطہ بھی اس سلطنت میں شامل رہا جبکہ باقی ماندہ بلوچ سرزمین بدستور ہندوستانیوں کے قبضہ میں تھا مگر انھیں اس دور افتادہ اور لق دق صحرا سے کسی فائدے کی امید نہیں تھی۔لہٰذا ان کی دلچسپیاں بھی اندرون ہند تک محدود رہیں اور یہ خطہ اندرونی طور پر آہستہ آہستہ دوبارہ آزاد اور خودمختار ہوتا گیا اور یہاں کے قبائل اپنے دیرینہ نظام قبیلہ داری کے تحت زندگی گذارتے رہے مگر ان کا اتحاد یہ ٹوٹ چکا تھا اور انھیں از سر نو منظم ہونے کیلئے وقت، وسائل اور قیادت کی ضرورت تھی پارتھی حکمرانوں کا دور مکمل انتشار اور انارکیت کا دور تھا پورا ملک طوائف الملوکی کا شکار تھا اور مختلف خطے آزادی اور خودمختاری حاصل کر چکے تھے اور ان کے بعد آنے والے آشکانی بھی طوائف الملوکی کا خاتمہ نہ کر سکے اور ایران کی عظمت پارینہ بحال کرنے میں انھیں ناکامی ہوئی۔

249ق م میں یونانی اقتدار ختم ہوا 249ق م سے 226ء تک تقریباً 475 سالوں کے عرصہ میں ایران کی وہ ساری عظمت ختم ہو چکی تھی جو پیشدادی، میدی اور ہخامنشی حکمرانوں نے قائم کی تھی مگر یونانی حملوں اور قبضے کے بعد ایران سنبھل نہ سکا حالانکہ آشکانی اور پارتھی جو قدیم ایرانی (آرین) تھے وہ بھی ایران کو نہ سنبھال سکے۔

226ء میں ساسانیوں نے ایران پر قبضہ کرلیا اور اردشیر پاپکان ساسانی نے یکے بعد دیگرے تمام خودمختار اور آزاد ریاستوں کا خاتمہ کر کے ایران کو دوبارہ مرکزیت دی اور تمام ریاستوں کو ایک ہی مرکز کے ماتحت کر دیا۔تاریخی واقعات یہ ثابت کرتے ہیں کہ ساسانیوں کے

اقتدار کو قائم کرنے میں انہی قبائل نے اپنا کردار ادا کیا جو قبل ازیں میدی ہخامنشی، پارتھی اور آشکانی اقوام کے اقتدار کے قیام کا سبب بنے تھے۔ان میں بلوچ قبائل سرفہرست اور مرکزی حیثیت رکھتے تھے۔فردوسی کے الفاظ ہی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ بلوچوں کی کمک و مدد اور تعاون کے بغیر ان اقوام کیلئے اپنا اقتدار قائم کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔

ساسانیوں نے سابقہ ایرانی اقوام کی نسبت ایرانی تہذیب کو زیادہ وسعت اور عروج عطا کیا اور انہوں نے عظیم الشان فوجی قوت قائم کی ایران کی تاریخ میں اس سے پہلے ایسی مضبوط اور عظیم فوجی قوت کی مثال نہیں ملتی تھی۔اس میں ایران کے تمام قبائل اور ایرانی مقبوضات اور نو آبادیات کے اقوام کثیر تعداد میں شامل تھے۔ساسانی فوج میں بھی بلوچوں کا مقام و مرتبہ بلند تھا ساسانی اقتدار کے کافی عرصے تک بلوچ قبائل اور ساسانیوں کے درمیان تعلقات انتہائی خوشگوار اور دوستانہ رہے مگر 480ء میں جب مزدک نے نوشیروان کے والد قباذ کو اپنے عقیدے میں شامل کیا تو بلوچ جو فوج کے ہراول دستے میں تھے انھوں نے اس سے اختلاف رکھا اور قباذ کے بھائی طہماسپ کے ہاتھوں بیعت کر کے قباذ کے خلاف بغاوت کر دی جس کے نتیجے میں 480ء سے 531ء تک ایرانی اور بلوچ قبائل کے درمیان خون ریز جنگیں ہوئیں۔498ء میں بلوچ قباذ کو شکست دیکر طہماسپ کو برسر اقتدار لانے میں کامیاب ہو گئے مگر 501ء میں طہماسپ قتل ہوا اور قباذ نے دوبارہ تخت پر قبضہ کرلیا لیکن بلوچوں کے ساتھ ان کی جنگیں ختم نہ ہوئیں حتیٰ کہ بقول فردوسی قباذ بلوچوں کو نیست و نابود کرنے کی کوشش میں ہی مر گیا اور اس کے بعد 531ء میں نوشیروان برسر اقتدار آیا اور آخر کار بلوچوں کو کوشش بسیار کے بعد بحیرہ ہیرکانیہ (Caspian Sea) کوہ البرز، تبریز، مازندران اور گیلان میں شکست دینے میں کامیاب ہوا۔جسکی وجہ سے بلوچوں کا زور ٹوٹ گیا اور ان کی ہمت جواب دے گئی نوشیروان ہیرکانی بلوچوں کے خودمختار علاقے کی آزادی کو ختم کر کے اس خطے پر قابض ہوا اس طرح ہیرکانی بلوچوں کا زور ٹوٹ گیا اور ان کا عظیم عروج پایہ تکمیل کو پہنچا۔نوشیروان کے اس جابرانہ اور ظالمانہ فعل کے بعد بلوچ ہیرکانی خطے میں کبھی بھی دوبارہ آزاد اور خودمختار اتحادیہ قائم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔اس طرح ساسانیوں کے دور اقتدار میں بلوچوں کے پاس جو علاقہ باقی رہا اسے نقشہ نمبر 2 میں واضح کیا جارہا ہے۔

ساسانی اقتدار کے آخری دور 634ء میں ایران پر عربوں کے حملے شروع ہو گئے۔ ایرانی افواج عربوں سے شکست پر شکست کھاتے رہے۔ اس نئی صورتحال سے سندھ کے رائے خاندان نے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا اور پورے مکران مع سراوان و جھالاوان پر راجہ رائے چچ سندھی نے قبضہ کرلیا۔ اس طرح بلوچ خطہ عرب، ایرانی اور سندھیوں کی کشمکش اور ہوس ملک گیری کی وجہ سے ایک بار پھر تقسیم ہوا۔ سندھیوں نے 636ء میں مکران پر قبضہ کرلیا مگر عربوں نے 644ء میں انھیں مکران سے نکال باہر کیا اور اموی عہد میں عربوں نے پورے بلوچ خطے تا حد گنداوہ تک اپنا قبضہ جمالیا۔ ابن قاسم نے ملتان تک فتوحات کیں اور راجہ داہر کی سلطنت کے پرخچے اڑا دیئے۔ 715ء تک ملتان بھی عربوں کے قبضہ میں آچکا تھا عرب حملہ آور چونکہ ایک ایسے مذہب کا پیغام لیکر اٹھے تھے جس میں انسانی برابری، مساوات، امن، اخوت اور بھائی چارے کا سندیسہ تھا لہٰذا بلوچوں نے حضرت عمر فاروقؓ کے زریں دور (634ء تا 644ء) میں ہی اسلام قبول کرلیا اور عرب افواج میں شامل ہو گئے اور عربوں کی جہانگیری میں ان کیساتھ مل گئے البتہ اموی عہد میں اس خطے میں آباد بلوچ قبائل کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا جانے لگا تو انھوں نے ان کے خلاف بھی ایک لمبی اور مسلسل جنگ کا آغاز کیا۔ ان جنگوں کی تفصیلات کتب تاریخ میں ملتی ہیں۔ عباسی عہد میں یہ خطہ ماسوائے ایک دور دراز چوکی کے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا لہٰذا بلوچ قبائل اندورنی طور پر خود مختار اور آزاد رہے۔ عرب سیاحوں نے بلوچ خطے میں تفصیل کے ساتھ بلوچ قبائل کی موجودگی کا تذکرہ کیا ہے اور کرمان، مکران، سیستان، سراوان اور جھالاوان میں ان کی آزادانہ اور خود مختار حیثیت کا اعتراف کیا ہے۔ حتیٰ کے کوئٹہ سے قندھار تک کے خطے کے لئے لفظ بلوش بالش یا دالشان جو بلوچ کی عربی تلفظ ہے استعمال کیا ہے۔ 16 مگر اس دور تک بھی بلوچ اپنے خطے میں اپنی کوئی مستحکم حکومت نہ بنا سکے وہ سپاہیانہ زندگی گذارنے کے خوگر تھے اور اپنے پہاڑوں اور وادیوں میں آزادانہ گھومنے پھرنے کے عادی تھے۔

اسی طرح غزنوی عہد میں بھی بلوچوں کی کثیر تعداد کا ذکر مشرق میں جھالاوان سے لیکر مغرب میں کرمان تک اور پورے دشت لوط، خراسان کے بلوچ علاقوں، طون و طبس، خبس اور جنوب میں پورے ساحلی علاقے میں بندر بلوچ (بندر عباس) سے کراچی کے ساحلوں تک، جنوب مغربی افغانستان سمیت پورے سیستان میں اور تا حد بولان کتب تاریخ میں موجود ہے

۔تاریخ سندھ کے مصنف اعجاز الحق قدوسی کے مطابق ہندوستان پر غزنوی حملوں کے دوران بلوچوں کی ایک بڑی تعداد غزنوی افواج کے ہمرکاب تھی۔ 17 یہ بلوچ سیستان، خراسان، سراوان اور جھالاوان کے تھے۔ مکران کے بھی بلوچ اس فوج میں شامل تھے کیونکہ مکران کا حاکم ابوسعید بلیدی غزنوی حکمران کا اتحادی تھا۔ باقی بلوچ علاقوں کے قبائل کی بھی ایک بڑی تعداد غزنویوں کے ساتھ شدید جھڑپوں کے بعد ان کی سیادت اور بالادستی تسلیم کرچکی تھی البتہ خراسان، دشت لوط، کرمان اور ساحل ایرانی مکران کے بلوچ غزنوی عہد میں آخر دم تک بغاوتیں برپا کرتے رہے البتہ مکران کا خطہ غزنوی حکومت کے زیر اثر آگیا تھا۔

نقشہ نمبر 2 میں جو علاقے دکھائے گئے ہیں پندرہویں عیسوی تک اسی طرح منتشر اور پراگندہ رہے اور بلوچ چودھویں صدی کے اختتام اور پندرہویں صدی کے آغاز تک کوئی مرکزیت قائم نہ کر سکے۔ تیرہویں صدی عیسوی میں بلوچ خطہ منگول اقتدار کے زیر اثر آیا مگر وسط ایشیاء اور ایران میں منگول کمزور پڑ گئے اور انھیں سلجوق ترکوں کے ہاتھوں پے درپے شکستیں ہوئیں تو قلات پر بھی ان کی گرفت کمزور پڑھ گئی۔ منگولوں کی اس کمزوری سے قلات کے گرد و نواح کے وہ بلوچ قبائل جو برسوں سے موقع کی تاک میں تھے کہ دراندازوں اور قابضین کو اپنی سرزمین سے نکال

سکیں انھوں نے قلات کے قلعے پر حملہ کر کے مغل گورنر کو نکال باہر کیا اور اس طرح خطے میں 1410ء میں بلوچوں کے قمبرانی قبیلے نے بلوچ اقتدار قائم کیا مگر اس کا دائرہ کار اور وسعت اتنی کم تھی کہ بس یہ چند دیہاتوں اور قصبوں پر مشتمل تھا مگر یہ متحدہ بلوچ ریاست کی طرف ایک بار پھر طویل خلا کے بعد دوبارہ آغاز تھا۔

1410ء سے 1948ء تک قمبرانی بلوچ قبیلے کی دو بڑی شاخوں میروانی اور احمد زئی نے 538 سال بلوچستان پر حکومت کی۔ ان دو خاندانوں میں بڑے باجروت اور اولعزم خوانین گذرے ہیں جنھوں نے بلوچوں کی قومی اور جغرافیائی وحدت کو یکجا کرنے اور سمیٹنے میں انمٹ کردار ادا کیا ان میروں اور خوانین میں میر میرو کمبرانی (جد اعلیٰ قبیلہ میروانی) میر عمر میروانی، میر بجار میروانی، میر احمد خان کمبرانی (جد اعلیٰ قبیلہ احمد زئی)، میر سمندر خان، میر عبداللہ خان، میر نصیر خان نوری، میر خدائیداد خان وغیرہ زیادہ قابل ذکر ہیں۔ میر احمد خان، میر عبداللہ خان اور غازی میر نصیر خان نوری بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ انہی تین فرمانرواؤں نے نہ صرف بلوچستان کے بکھرے ہوئے شیرازے کو یکجا کیا اور نصیر خان نوری نے تمام بلوچ کنفیڈریشنوں کو یکجا کر کے ایک ہی لڑی میں پرو دیا اور بلوچ قوم کے تقریبا سابقہ جغرافیہ کو بحال کر دیا۔

نصیر خان کے پاس اگر وسائل کی کمی نہ ہوتی تو شاید وہ ہیر کانی بلوچ خطہ کو بھی اپنے تصرف میں لاتے ان کے ارادے بہت بلند تھے اسی لئے جب احمد شاہ ابدالی نے سکھوں کے خلاف کامیاب مہمات کے بعد نصیر خان سے لاہور سمیت پنجاب کو بلوچ اور افغان اقوام میں تقسیم کرنے کی خواہش ظاہر کی تو نصیر خان نوری نے نہ صرف انکار کیا بلکہ بلوچستان کے جغرافیائی حدود کے بارے میں یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ:

"جہاں تک بلوچی بولی جاتی ہے وہاں تک بلوچوں کا وطن ہے"۔

اپنے اس قول کو نصیر خان اعظم نے بخوبی نبھایا گو کہ ہیر کانی علاقہ فتح نہ ہو سکا مگر مشرق میں دودائی بلوچوں کا وسیع علاقہ نصیر خان کے زیر اثر آیا۔ دودائی بلوچ دراصل ہوت بلوچ تھے جنہوں نے سولہویں صدی عیسوی میں ملتان سمیت ڈیرہ جات ہڑند و داجل، رحیم یار خان اور پورے سرائیکی خطے پر اپنی حکومت قائم کی تھی۔ سہراب خان دودائی کے تین بیٹے تھے جن کے نام پر تین شہر بسائے گئے یعنی ڈیرہ غازی خان، ڈیرہ فتح خان اور ڈیرہ اسماعیل خان۔ شیر شاہ سوری کے دور میں

ان تین بھائیوں نے شیر شاہ کی حمایت اور مدد کی تھی۔

نصیر خان اور ان کے والد عبداللہ خان قہار نے مشرق کی سمت بلوچ سرحدات کو خوب وسعت دی اور وہاں آباد اور سکونت پذیر بلوچ قبائل کو ایک ہی مرکز کے تحت لانے میں کامیابی حاصل کر لی۔ رند و لاشار قبائل جو پندرہویں اور سولہویں صدی عیسوی میں ایک بہت بڑی جمعیت کے مالک تھے اگر وہ آپس کی خانہ جنگی کی بجائے اس متحدہ فوج کو کسی بھی سمت لے جاتے تو فتوحات ان کے قدیم چومتی مگر بدقسمتی سے ہزاروں نوجوانوں کے خون کو ناحق قبائلی چپقلش میں بہانے کے بعد انھوں نے اپنی قوت برباد کر کے رکھ دی اور وہ بذات خود اپنے وطن سے ہجرت کر کے سندھ، پنجاب اور ہندوستان میں جا کر آباد ہو گئے۔

بہر حال نصیر خان نوری نے ایک وسیع و عریض خطہ فتح کر کے تمام منتشر و پراگندہ بلوچ قبائل کو ایک ہی لڑی میں پرو دیا اور بلوچ سرزمین کی سرحدیں مخصوص کیں تاکہ مستقبل میں ہمسایہ ممالک کی جانب سے کسی بھی توسیع پسندی کو سرحدوں سے باہر روکا جا سکے اور ساتھ ہی اس وسیع و عریض خطے میں پھیلے ہوئے ہزاروں بلوچ قبائل کو ایک مخصوص جغرافیائی وحدت عطا کی تاکہ وہ اپنے وطن میں آزادانہ زندگی گزار سکیں اور دنیا کے دیگر اقوام کے ہم پلہ آ سکیں۔

نصیرخان نوری نے بلوچ قوم کے جو حدود مقرر کئے تھے انہیں نقشہ نمبر 3 کے ذریعے واضح کیا جارہا ہے اور دراصل یہی بلوچ قوم کی سیاسی جغرافیائی اور قومی سرزمین ہے جسے تین مختلف ممالک میں منقسم کرکے اسکی قومی وحدت کو بھی منتشر اور پراگندہ کردیا گیا ہے۔

چونکہ جدید بلوچستان میر نصیرخان نوری کے عہد میں متحد و منظم ہوا لہٰذا انہی حدود کو بلوچستان کی سیاسی، جغرافیائی اور قومی حدود شمار کیا جاتا ہے ورنہ لسانی بنیادوں پر اس کے حدود اتنے وسیع و عریض ہوتے کہ انہیں اندازاً بیان نہیں کیا جاسکتا۔ نصیرخان نوری کے قائم کردہ بلوچ جغرافیہ کا کل رقبہ 3.40.000 مربع میل تھا جو ان کی رحلت 1794ء کے بعد مختلف مراحل سے گذرنے کے بعد آج انتہائی شدید تغیر اور بدنظمی کا شکار ہے نصیرخان کے بعد اسکے جانشین اس کے قائم کردہ حدود کی حفاظت نہ کرسکے۔ 19 ویں صدی کے اوائل میں اس خطے میں برطانوی ایجنٹوں کی آمد شروع ہوئی اور اپنے مقبوضات اور ہندی نوآبادیات کو روس کے نام نہاد خطرے سے بچانے کی خاطر برطانوی حکومت نے بلوچستان کی آزاد اور خودمختار بلوچ مملکت کو روند ڈالا۔

1810ء میں ہنری پوٹینگر (Hunery Pottinger) کی آمد سے لیکر 1893ء میں میر خدائیداد خان، خان بلوچ کی معزولی تک انگریزوں نے عملاً بلوچستان پر قبضہ کرلیا اور اس دوران اس کے اتنے حصے کر ڈالے کہ اسکا اصل حلیہ ہی بگڑ گیا اور بلوچ قوم کو سیاسی، جغرافیائی، قومی اور سیاسی بنیادوں پر ایک طویل عرصے کیلئے ایک بار پھر جدا کیا گیا۔ 1876ء میں معاہدہ مستونگ کے بعد تو انگریز بلوچستان کے سیاہ و سفید کے مالک بن گئے اور خان برائے نام رہ گیا۔ برطانوی حکومت ہند کے ایجنٹ کوئٹہ اور اسکا ایک نمائندہ قلات میں بیٹھ کر سارے امور کی نگرانی کرتے تھے اور خان کو قلات اور اسکے گرد و نواح کا برائے نام حکمران بنا کر بٹھایا تھا ورنہ اسکی حیثیت ایک انگریز تنخواہ خور ملازم کی سی ہو کر رہ گئی تھی۔ قبائلی سرداروں کی بڑی اکثریت نے انگریزوں سے دوستی کا ہاتھ ملایا۔ انگریزوں نے خان سے کوئٹہ ایک معاہدے کے تحت حاصل کیا اور اس سے ملحق چند پشتون علاقوں پر مشتمل علاقے کو برٹش بلوچستان کا نام دیکر ریاست قلات سے الگ کردیا ایران، افغانستان اور سندھ و پنجاب میں بلوچستان کے بہت سارے علاقے بھی شامل کردیئے۔ نقشہ نمبر 4 میں بلوچ سرزمین کی وہ کیفیت دکھائی جارہی ہے جو انگریزوں نے اسکی بنا ڈالی تھی۔

انیسویں صدی کی نوآبادیاتی دور میں برطانیہ نے ایران کو خوش رکھنے اور بلوچوں کی قوت کو تقسیم کرنے کی خاطر بلوچستان کے مغربی صحرا کا وسیع علاقہ اسے دیدیا۔ اسی طرح افغان سرحد سے متصل بہت سارے بلوچ علاقے افغانستان میں شامل کردیئے۔ باقی بچے کچے بلوچستان کو بھی اندرونی طور پر سندھ، پنجاب اور برٹش بلوچستان میں تقسیم کیا گیا اور خوانین قلات کے رقبے کو محدود کرکے اسکی مملکت کو بھی اندرونی طور پر بیلہ، خاران اور قلات کی ریاستوں میں بانٹ دیا گیا اور خان قلات کو ان ریاستوں کا سربراہ بنادیا گیا۔ اس طرح بلوچ قوم جغرافیائی سیاسی اور قومی لحاظ سے اپنی پوری تاریخ میں پہلی بار نہ سہی مگر بدترین طریقے سے ضرور منقسم کردیا گیا تھا۔

گریٹ گیم کے دوران بلوچستان میں آزادی کی تحریک نے زور پکڑا اور انگریز بالادستی سے نجات کیلئے نہ صرف بلوچ قبائل نے شدید مسلح مزاحمت کی بلکہ سیاسی اور آئینی جدوجہد بھی جاری رکھی۔ آخرکار ایک طویل اور صبر آزما جدوجہد کے بعد 12 اگست 1947ء کو برطانیہ نے بلوچستان کی آزادی کا اعلان کردیا مگر یہ ایک منقسم بلوچستان تھا اب بھی بلوچستان کے کچھ حصے پر ایران اور افغانستان کا قبضہ تھا جبکہ باقی ماندہ بلوچستان سندھ و پنجاب کے پاس تھے اب ان کے حصول کیلئے

فروخت ہو رہی ہے۔ حالانکہ یورپ میں یا قریبی ہمسایہ عرب ممالک میں ان اشیاء کی اتنی مانگ ہے کہ جس سے ایک سال کی پیداوار سے بلوچ زمیندار مالامال ہو سکتے ہیں مگر ان سب کیلئے اختیارات ہونے چاہیے کہ انسان اپنے لئے خود کچھ کر سکے۔

بلوچستان کی نسلی گروہوں میں بلوچ سرفہرست ہیں جو مشرق، مغرب، جنوب اور شمال مشرق میں آباد ہیں جبکہ شمال اور قدرے شمال مشرق میں پشتون قبائل آباد ہیں بنیادی طور پر جلو گیر(کچلاک) سے بالائی جانب پشتو زبان بولنے والے قبائل افغانستان کی رعیت تھے جو عبداللہ خان قہار کے دور میں بلوچستان کا حصہ بنے مگر کچھ علاقے انگریزوں نے بھی افغانستان سے ہتھیا کر برٹش بلوچستان میں شامل کر دیئے کیونکہ نصیر خان کا قول یہی تھا کہ صرف بلوچی زبان بولنے والے اور بلوچ قوم سے تعلق رکھنے والی سرزمین بلوچستان ہے لہٰذا جلوگیر سے بالائی جانب پشتو زبان بولنے والے قبائل کا علاقہ ہے جبکہ باقی ماندہ بلوچ خطہ زمانہ ماقبل تاریخ سے بلوچ قبائل کے ماتحت چلا آرہا ہے جسکا ایک حصہ بہرحال افغانستان جبکہ باقیماندہ ایران اور پاکستان کے پاس ہیں۔

بلوچوں کی معاشی حالت انتہائی ناگفتہ بہ ہے۔ ہر طرف غربت، افلاس، بھوک اور بیماریوں کا ڈیرہ ہے۔ کوئی بلوچ گھرانہ شاید ہی خوش قسمت ہوگا کہ جہاں کبھی فاقے نہ ہوں وگرنہ بلوچوں کی حالت یہ ہے کہ انھیں ایک وقت کی روٹی بھی میسر نہیں ہے حالانکہ وہ ایک ایسی سرزمین کے وارث ہیں کہ جہاں سمندر ہے، معدنیات ہیں بین الاقوامی بری، بحری اور فضائی راستے ہیں جہاں انواع واقسام کے پھل پھول اناج سبزیاں اور جنگلی جڑی بوٹیاں پیدا ہوتی ہیں مگر وہاں کا مالک ننگا اور بھوکا مختلف بیماریوں سے اذیت کا مارا تڑپ تڑپ کر مر رہا ہے۔ عالمی انسانی فلاحی اداروں کو افریقہ کے بھوکے اور بیمار تو نظر آتے ہیں کہ جنکی امداد اور دیکھ بھال کیلئے تمام مغربی اور دیگر عالمی قوتیں سرگرم ہو جاتی ہیں مگر انھیں بلوچستان میں بھوک، پیاس، بیماری اور سیاسی عدم استحکام نظر نہیں آتا۔ موجودہ دور میں مختلف وجوہات کی بنا پر ہزاروں بلکہ لاکھوں بلوچ اپنے ہزاروں سالہ قدیم آبائی مساکن کو خیرباد کہہ کر مہاجروں کی سی بدترین زندگی گذار رہے ہیں اور وہاں انھیں مہاجروں جیسے حقوق بھی میسر نہیں۔ بدترین حالات اور معاشی بدحالی میں کسی قوم کا زیادہ عرصہ تک اپنا وجود برقرار رکھنا مشکل ہوتا ہے اور سیاسی اختیارات بھی ان کے پاس نہ ہوں تو شاید زوال زیادہ

بھی سرگرم ہوتا تھا کہ 27 اور 28 مارچ 1948ء کو ریاست قلات سمیت باقی ماندہ بلوچستان پر پاکستانی انتظامیہ نے قبضہ کر کے نو آزاد شدہ بلوچستان کی آزادی سلب کر لی۔

موجودہ دور میں منقسم بلوچستان کی جغرافیائی محل وقوع کچھ یوں ہے کہ ایران مغرب کی سمت جبکہ افغانستان شمال میں اس کے ہمسایہ ہیں جبکہ سندھ و پنجاب کے خطے مشرق میں اور جنوب مشرق میں خیبر پشتونخواہ کا علاقہ ہے۔ جنوب میں ایک طویل و عریض سمندر بلوچستان کی جغرافیائی علاقائی اور معاشی اہمیت کو بڑھاتی ہے اسکی زمینی ساخت چار اقسام پر مشتمل ہے۔

(1) اپر ہائی لینڈ (بالائی پہاڑی علاقہ) Upper High Land۔ یہ وسطی اور شرقی وسطی علاقہ پر مشتمل ہے اسکی پہاڑیاں سطح سمندر سے 12000 فٹ جبکہ وادیاں 5000 فٹ تک بلند ہیں۔

(2) لوئیر ہائی لینڈ (نچلی پہاڑی علاقہ) Lower High Land۔ مشرقی بلوچستان میں کوہ سلیمان، جنوبی حصے میں پب و کیرتھر اور مغرب میں چاغی کی پہاڑیاں شامل ہیں جنکی سطح سمندر سے بلندی 5000 فٹ سے 1500 فٹ ہے۔

(3) میدان Plains۔ اس زمرے میں کچھی، لسبیلہ اور دشت مکران کے میدان آتے ہیں جنکی سطح سمندر سے بلندی 250 فٹ کے لگ بھگ ہے۔

(4) صحرا Desert۔ بلوچستان کا جنوب مغربی خطہ صحرا پر مشتمل ہے۔

بلوچوں کی کل آبادی کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے کیونکہ سیاسی، سماجی، معاشی، قومی، تعلیمی، جغرافیائی اور ثقافتی اختیارات سے محروم یہ قوم دنیا کے مختلف کونوں میں دربدر اور اپنی اکائی اور کل سے الگ تھلگ ہے مگر مندرجہ بالا جغرافیائی حدود میں بلوچوں کی آباد 3 سے 4 کروڑ کے لگ بھگ ہے مگر یہ اتنے حصوں میں منقسم ہیں کہ انھیں کبھی یکجا شمار نہیں کیا گیا وگرنہ ان کی آبادی مندرجہ بالا اعداد سے بھی زیادہ ہو سکتی ہے۔

بلوچستان میں ہر موسم کے پھل پھول سبزی اور اناج کی پیداوار ہوتی ہے کیونکہ یہ خطہ زمین موسموں کا گلدستہ ہے یہاں بیک وقت چاروں موسموں سے لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے کہیں گرمی تو کہیں سردی کہیں بہار تو کہیں پت جھڑ۔ کثرت سے پھلوں کی پیداوار کا یہ عالم ہے کہ یہ زمین پر پڑے پڑے سڑ جاتے ہیں یا بازار میں اعلیٰ کوالٹی کے پیاز 15 روپے دڑی (۵ کلو) کے حساب سے

سے اونچائی 3650 میٹر ہے اور طوالت 245 کلومیٹر ہے۔

مکران کے پہاڑوں کے تین سلسلے مشرق سے مغرب اور شمال مغرب کی جانب پھیلے ہوئے ہیں مکران کے پہاڑوں کا ساحلی سلسلہ 451 کلومیٹر تک بحیرہ عرب کیساتھ ساتھ پھیلا ہوا ہے جو جنوبی ایرانی بلوچستان کے پہاڑوں کا سلسلہ ہے۔ اس سلسلے کے کچھ شمال میں اور متوازی مکران کے مرکزی پہاڑوں کے سلسلے کی شمالی شاخ مکران کے پہاڑوں کے تیسرے سلسلے یعنی سیاہان پہاڑوں سے جا ملتے ہیں جو مکران کو خاران کے صحرا سے جدا کرتا ہے۔

بلوچستان کے پہاڑی سلسلوں کے درمیان طویل درے ہیں جو ایک شہر کو دوسرے شہر بلکہ مشرق کو مغرب سے ملاتی ہیں اور ماضی قدیم سے ان کی حیثیت مشرق اور مغرب کے درمیان دروازوں کی سی رہی ہے۔ ان دروں میں درہ بولان سراوان میں اور درہ مولہ جھالاوان میں واقع ہیں۔ زمانہ ماقبل تاریخ سے ان دروں کے راستے تجارتی کاروان اور حملہ آور اقوام مغرب سے مشرق اور مشرق سے مغرب کی جانب سفر کرتے تھے۔ آریاؤں نے بھی سندھ و ہند میں داخل ہونے کیلئے بلوچستان کا یہی درہ استعمال کیا تھا۔ تب سے آج تک اس درے کی تجارتی اور فوجی اہمیت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ آج اس ترقی یافتہ دور میں ان دروں کی اہمیت دو چند ہو گئی ہے۔ درہ بولان کوئٹہ کے قریب کولپور سے شروع ہوتی ہے اور بی کے قریب ڈھاڈر کے مقام پر ختم ہوتی ہے اور درہ مولہ خضدار کے قریب نڑ نامی گاؤں اور زہری کی سمت سے پاشتہ خان نامی گاؤں سے شروع ہوتی ہے اور گنداواہ پر جا کر کھلتی ہے۔ اس طرح یہ درے تقریباً سارا سال آمد و رفت کیلئے استعمال ہوتے ہیں البتہ درہ مولہ بارش اور سیلابی موسم میں بند رہتا ہے۔ درہ بولان کے ساتھ ساتھ دریا بولان اور درہ مولہ کے ساتھ ساتھ دریا مولہ بہتے ہیں۔ ان دروں کے علاوہ مکران اور چاغی سمیت دیگر کئی علاقوں میں چھوٹے بڑے درے موجود ہیں جو ذیلی علاقوں کو آپس میں ملاتے ہیں بلوچستان افغانستان کے سرحدی شہر چمن میں خوجک کا درہ واقع ہے اور یہاں پر ایشیاء کی سب سے بڑی ریلوے سرنگ واقع ہے۔ درہ بولان میں بھی انگریزوں نے پہاڑوں میں سرنگ (Tunnel) بنا کر ریلوے لائن کو بی سے کوئٹہ پہنچایا اور دریا بولان کے کنارے کنارے قدیم شاہراہ کو زمینی سفر کیلئے از سر نو تعمیر کروایا۔

بلوچستان دریاؤں کے لحاظ سے زیادہ امیر نہیں ہے مغرب میں مکران سے لیکر مشرق میں

تیزی کے ساتھ آئے۔

دریافت شدہ آثار قدیمہ کے مطابق بلوچستان کا خطہ دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں کا گہوارہ ہے اور اسکا تہذیبی سفر تقریباً 11000 سال قدیم ہے جسکی مثال مہر گڑھ کی وہ قدیم آبادی ہے جو درہ بولان کے حدود میں ڈھاڈر سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر دریافت ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ مکران، بیلہ، جھالاوان، کوئٹہ، قلات، سراوان، خاران اور دیگر علاقوں میں پھیلے ہوئے آثار قدیمہ اس قدیم انسانی تہذیب کے نقوش کے ہیں جو اس خطے میں گذری ہے جن کے بارے میں ماہرین کا خیال ہے کہ یہ انسان کے ابتدائی سکونت کے آثار ہیں اور انسانی تہذیب کے سفر کی شروعات اسی خطے سے ہوئی ہے۔ بلوچستان کا خطہ زیادہ تر پہاڑی ہے۔"

بلوچستان کے زیادہ پہاڑی منطقے مرکزی اور شمال مشرقی حصوں میں واقع ہیں اس منطقہ میں سے سلیمان کے پہاڑوں کا چھوٹا سا سلسلہ گذرتا ہے اس پہاڑ کے متوازی افغانستان اور پاکستان کے سرحد کے ساتھ ساتھ تقریباً 500 کلومیٹر طویل توبہ کاکڑی، کا بڑا پہاڑی سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ توبہ کے سلسلہ کا جنوبی پھیلا ہوا حصہ خواجہ عمران کے پہاڑی سلسلے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جسکی اونچائی سطح سمندر سے 2704 میٹر ہے۔ خواجہ عمران کے جنوب مغرب میں سرلٹ کے پہاڑ واقع ہیں جو شررود کی وادی کو شوراوک کی وادی سے الگ کرتے ہیں۔ توبہ کاکڑی اور خواجہ عمران کے دروں میں سرسبز چراگاہیں ہیں جن میں بلوچ اور پشتون قبائل اپنے مال مویشی چرانے کیلئے لاتے ہیں۔

افغانستان کی سرحد پر مشرق سے مغرب کی جانب کوہ سلطان (چاغی) کے پہاڑوں کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے جو ایران افغانستان اور بلوچستان کے سرحدوں کے نقطہ اتصال پر ختم ہوتی ہے جہاں کوہ ملک سیاہ واقع ہے جو سطح سمندر سے 1648 میٹر بلند ہے۔ کوئٹہ شہر کے جنوب میں کوہ ہربوئی و سٹی کا سلسلہ واقع ہے۔ اس سلسلے کی عام لمبائی 355 کلومیٹر ہے اور چوڑائی 112 کلومیٹر ہے جبکہ مرکزی اونچائی 2000 میٹر تک پہنچتی ہے۔ اس سلسلے کے جنوبی دامن میں کوہ کیرتھر کا سلسلہ اپنی شاخوں کیساتھ پھیلا ہوا ہے جو مشرقی بلوچستان کو سندھ سے جدا کرتا ہے۔ اس پہاڑی سلسلے کی سطح سمندر سے اوسطاً اونچائی 1524 میٹر ہے۔ ہربوئی سلسلے کے مغرب میں راس کوہ کے پہاڑوں کا سلسلہ واقع ہے جو خاران کے ریگستان کو چاغی کے صحرا سے جدا کرتا ہے۔ اسکی سطح سمندر

دریائے سندھ تک ایسا کوئی دریا نہیں جو سارا سال بہتا ہو اور مسلسل جاری ہو۔ کو ہ ندی (لوہڑ)، ناڑی، بولان، شیریں آب (شیر ناپ) جو بلوچستان کے مختلف حصوں میں بہتے ہیں اور اپنے ڈیلٹوں میں پہنچتے ہیں جہاں تقریباً ان کے تمام پانی سے زمینوں کو آباد کرنے میں استفادہ ہوتا ہے۔ ماشکیل، بڈو اور رخشان کے دریا جو بلوچستان کے مغربی حصوں کے ڈیلٹوں اور صحراؤں میں جا کر کھارے پانی کی جھیلوں (ہامون) میں گم ہو جاتے ہیں۔ سب، پورالی، دشت، نہنگ اور بہت سے دریا جو بلوچستان کے جنوب میں بہتے ہیں سال کے بیشتر حصے میں خشک رہتے ہیں صرف ہنگول اس امر سے مستثنیٰ ہے۔ ہنگول بلوچستان کا سب سے بڑا دریا ہے جس کی لمبائی 573 کلومیٹر ہے جس کا پانی تمام سال جھالاوان اور مکران کے مشرقی حصے اور بیلہ کی وسیع اراضی کو سیراب کرتا ہے۔ شمال کی جانب دریائے ژوب قابل ذکر دریا ہے جس میں بارانی موسم کے علاوہ بھی عام دنوں میں تھوڑا بہت پانی بہتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ دریائے بولان میں سارا سال پانی بہتا رہتا ہے جو بولان کی وادیوں اور کچھی میں آبپاشی کے کام آتا ہے۔

بیشتر دریاؤں کی طرح جھیلیں بھی بہت جلد خشک ہو جاتی ہیں یا نمک کی ہلکی سفید چادر کی تہہ میں تبدیل ہو جاتی ہیں ان کھارے پانی والی جھیلوں کا پیدا ہونا شمال مشرقی بلوچستان کی زمینوں کی سطح کی تشکیل کی خصوصیت ہے۔ مشہور جھیلوں میں زنگی ناوڑ (نوشکی) ہامون ماشکیل (خاران)۔ سرندہ (لسبیلہ)، ہنہ جھیل (کوئٹہ) وغیرہ شامل ہیں۔ آب و ہوا کے لحاظ سے بلوچستان کے مختلف علاقوں میں سردیوں میں شدید سردی اور گرمیوں میں موسم معتدل رہتا ہے اور بعض علاقے گرمیوں میں شدید گرم اور سردیوں میں معتدل رہتے ہیں۔ سردی کا زور زیادہ تر بلند پہاڑی علاقوں میں ہوتا ہے۔ حالیہ چند برسوں میں خشک سالی اور بارشوں کی کمی کی وجہ سے گرمی کی شدت میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ کوئٹہ جیسے سرد اور معتدل شہر میں بھی گرمی کی شدت میں سخت اضافہ ہوا ہے اور بعض اوقات درجہ حرارت 40 ڈگری سینٹی گریڈ سے بھی تجاوز کر جاتا ہے۔ مغربی اور جنوب مغربی صحراؤں میں سارا سال اور خاص کر گرمیوں میں جلا دینے والی تند و تیز آندھیاں چلتی ہیں جن میں سفر کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ ریت کے بڑے بڑے ٹیلے ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں اور نئے ٹیلے بنتے ہیں۔ یہ آندھیاں سخت خوفناک ہوتی ہیں بعض اوقات اگر ریت اور مٹی کے اس طوفان کے راستے میں کوئی آبادی آ جائے تو اسے چند ہی گھنٹوں میں ملیا میٹ کر کے رکھ دیتی ہے۔ ان

آندھیوں اور جھکڑوں کو مقامی لوگ بادِ صد و بیست روز یعنی 4 مہینے تک چلنے والی ہوا کہتے ہیں۔

بلوچستان کا موسم خشک ہے اور بارشوں کا تناسب انتہائی کم یعنی زیادہ سے زیادہ 12 اور کم از کم 13 انچ سالانہ ہے۔ خشک سالی یہاں کیلئے کوئی انوکھی بات نہیں ہے کوئی قابل ذکر سارا سال بہنے والا دریا بھی نہیں ہے۔ جھیلیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ پہاڑوں میں پانی کے ذرائع مفقود ہیں۔ زراعت کا زیادہ تر دارومدار کاریزات اور ٹیوب ویلوں پر ہے۔ خشک موسم ہونے کی وجہ سے جنگلات کی بھی شدید کمی ہے اور تقریباً تمام پہاڑی سلسلے خشک و چٹیل اور سنگلاخ ہیں۔ کوہ وسطی ہربوئی میں چند ایک مقامات پر اور کوہ سلیمان کی تنگ گھاٹیوں میں تھوڑے بہت درخت دیکھنے کو ملتے ہیں۔ زرغون کے پہاڑ میں صنوبر کے جنگلات ہیں مگر وہ اب نہ ہونے کے برابر رہ گئے ہیں۔ قلات میں ہربوئی کے مقام پر اور کوئٹہ اور مستونگ کے درمیان کوہ چلتن کے خوبصورت دامن اور تنگ دروں میں کچھ جنگلات نظر آتے ہیں وگرنہ پورے پہاڑی سلسلے اور میدان وصحرا جنگلات سے خالی ہیں۔ البتہ ان پہاڑی سلسلوں کے درمیان چھوٹی بڑی خوبصورت وادیاں اور چراگاہیں ہیں۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ بلوچستان کے تقریباً تمام چھوٹے بڑے شہر جو پہاڑی علاقے میں آباد ہیں سب پہاڑی وادیاں ہیں کوئٹہ، مستونگ، قلات، خضدار، سوراب حتیٰ کہ بیشتر پہاڑی وادیاں ایسے ہیں جہاں قابل ذکر آبادی نہیں ہے لیکن وہاں بڑے بڑے چراگاہ ہیں جہاں سارا سال مقامی اور دور دراز کے چرواہے اپنے بھیڑ بکریوں کے بڑے بڑے ریوڑوں کے ساتھ گھومتے رہتے ہیں ان وادیوں میں قدرتی چشمے ہیں جنکی وجہ سے زمین نم ہو کر قدرتی گھاس وافر مقدار میں اگاتی ہے۔

نباتات اور جڑی بوٹیوں کی وجہ سے بلوچستان بین الاقوامی سطح پر شہرت کا حامل ہے اور اگر کسی سال توقع سے زیادہ بارش اور برفباری ہو تو میدان اور پہاڑ مختلف اقسام کی جنگلی بیل بوٹوں اور جڑی بوٹیوں سے بھر جاتے ہیں۔ نہ صرف مقامی سطح پر ان سے بلوچ قبائل استفادہ کرتے ہیں بلکہ بڑی بڑی دواساز کمپنیاں ان جڑی بوٹیوں کو خرید کر انھیں انسانی زندگی بچانے اور مختلف دواؤں کی تیاری میں استعمال کرتی ہیں۔

میوہ دار باغات کے لحاظ سے بلوچستان کافی اہم اور مشہور ہے۔ مکران اور خاران کے انتہائی نایاب کھجور کی مختلف اقسام کوئٹہ، مستونگ، زیارت کے ذائقہ دار انگور، بلوچستان کے سرد علاقوں

کے مختلف اقسام کے سیب، چیری، خوبانی، آلو، انار، شہتوت وغیرہ اور گرم علاقوں کے چیکو، ناریل، آم، مالٹے، لیموں، کیلے وغیرہ۔ بلوچستان کے ہر حصے میں گندم کاشت کی جاتی ہے، علاوہ ازیں کپاس اور چاول کی بھی زبردست پیداوار ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ زیتون (olive) کے بھی درخت اور باغات لگائے گئے ہیں جنگی پیداوار اور افزائش حوصلہ افزاء ہے۔ ساحل مکران پر ناریل اور پپیتے کے بھی کامیاب تجربات ہوئے ہیں۔ غرضیکہ دنیا کا ہر وہ پھل جو بیک وقت کسی خطے میں نہیں ہوتا، بلوچستان میں یہ تمام پھل پیدا ہوتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ

" کہیں کے دال کی قیمت سونے کے بھاؤ ہوتی ہے اور کہیں کا سونا دال کے بھاؤ بھی نہیں بکتا"

بلوچستان کے پہاڑی علاقوں میں پہاڑی دنبے، پہاڑی بکریاں، وادیوں اور پہاڑی دامنوں میں خرگوش، ہرن، اڑیال، لومڑی، گیدڑ، بھیڑیے اور لگڑ بھگڑ بھی ملتے ہیں۔ ہنگول میں پہاڑی چیتے بھی پائے جاتے ہیں۔ دشتوں اور صحراؤں میں جنگلی کتے جنھیں بلوچی میں باشومہ کہتے ہیں بھی ملتے ہیں جسے بھیڑیے سے زیادہ خطرناک سمجھا جاتا ہے۔ ماشکیل، رخشان اور بمپور (ایرانی بلوچستان) سمیت سراوان کے پہاڑوں اور کچھی کے میدانوں میں جنگلی سور ملتے ہیں۔ پرندوں میں چکور، شاہین کی مختلف اقسام، تیتر، تلور اور عام پرندوں کے مختلف اقسام پائے جاتے ہیں۔ نوشکی، بیلہ، خاران اور کچھی کے علاقوں میں واقع جھیلوں پر سینکڑوں اقسام کے لاکھوں پرندے سردیوں میں روس کے مختلف علاقوں سے ہجرت کر کے آتے ہیں۔ رینگنے والے جانوروں میں مختلف اقسام کے سانپ اور چھپکلی ملتے ہیں اس کے علاوہ مختلف اقسام کے رینگنے والے جانور بھی ملتے ہیں۔ دریائے ہنگول میں مگر مچھ بھی بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

بلوچستان کی علاقائی اور جغرافیائی محل وقوع اور اہمیت کو دیکھتے ہوئے بھی اسے بالائے طاق رکھا گیا اور شروع دن سے موجودہ دور تک حکمرانوں نے یہاں رسل و رسائل کو کوئی ترقی نہیں دی۔ بلوچستان کے دور دراز کے علاقے جنکی اہمیت بھی زیادہ ہے باقی ملک سے کٹے ہوئے ہیں۔ طویل ترین کچھ پائدار پختہ راستے اور ٹوٹی پھوٹی سڑکیں ہیں۔ سڑک کے ذریعے سفر کرنا کسی عام شخص کے بس کی بات نہیں ہے ماسوائے ان علاقوں کے جہاں حکمرانوں کے معاشی مفادات وابستہ ہیں اور انھیں مالی فائدے اور لوٹ مار کی امید ہے، باقی تمام بلوچستان میں جہاں عام بلوچ آباد ہیں

سڑک اور رسل و رسائل نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ ایسے علاقے بھی بلوچستان میں ہیں جہاں لوگ تو ہیں مگر آج تک انہوں نے گاڑی یا موٹر سائیکل تک نہیں دیکھی اور مشینری نام کی کسی چیز سے واقف نہیں اور وہ غاروں یا کچے گھروں میں رہتے ہیں مگر باقی دنیا سے تقریباً کٹے ہوئے ہیں۔ اندرون بلوچستان میں لوگ سفر کے دوران اکثر راستہ بھٹک جاتے ہیں، کیونکہ پختہ سڑکیں تو ہیں نہیں جو کچے راستے ہوتے ہیں اکثر و بیشتر بارش اور طوفانوں میں ان کے نشانات مٹ جاتے ہیں جنکی وجہ سے اصل راستے سے مسافر اکثر و بیشتر بھٹک جاتے ہیں البتہ جنوبی سمت میں کوئٹہ سے کراچی اور کراچی سے گوادر تک عالیشان سڑکیں تعمیر کی جارہی ہیں تاکہ وہاں کے وسائل پر دسترس حاصل کیا جاسکے۔ اسی طرح جہاں جہاں معدنی وسائل دستیاب ہیں وہاں چاہے انسانی آبادی نام کی کوئی چیز نہ ہو مگر وہاں عمدہ سڑکیں تعمیر کی جارہی ہیں جنکا مقصد ماسوائے وسائل لوٹنے کے اور کچھ نہیں۔ جہاں سڑکوں کی ضرورت ہے وہاں تو ایک انچ سڑک تعمیر نہیں ہوتی اور فنڈز کی کمی اور وسائل کی عدم دستیابی کی بات کی جاتی ہے مگر جہاں معدنی ذخائر کے خزانے موجود ہیں وہاں سڑکوں کو ترقی دینے اور تعمیر کرنے کیلئے بیرونی کمپنیوں کو ٹھیکے دیئے جاتے ہیں۔ ریلوے کی حالت بھی انتہائی ناگفتہ بہ ہے۔ برطانوی دور میں قائم شدہ لائنیں ابھی تک جوں کی توں ہیں ان میں کوئی اضافہ یا ترقی نہیں ہوئی۔

بلوچستان کے پاس ایک طویل ساحل سمندر ہے اور اس پر کافی مشہور مقامات اور سواحل ہیں ان میں گوادر، پسنی، جیونی، اور ماڑہ، کلمت، چاہ بہار، میناب اور سونمیانی کافی اہم ہیں ان میں اکثر کوہی راس اور ٹاپو ہیں جن پر خوبصورت اور چھوٹی بڑی بندرگاہیں بنائی جاسکتی ہیں اور گوادر میں ایک ڈیپ سی پورٹ منصوبہ بھی تکمیل پاچکا ہے جہاں غیر ملکی جہازوں کے ذریعے غیر ملکی تجارت شروع ہوچکی ہے۔ مگر بدقسمتی سے یہ منصوبہ بلوچستان کے عوام کیلئے کوئی خاطر خواہ فائدہ مند ثابت نہیں ہوا بلکہ اس سے پنجاب کے بجھتے چراغ روشن کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ پسنی میں چھوٹی سی بندرگاہ ہے ان سمندری بندرگاہوں پر مقامی ماہی گیر پرانے اور دقیانوسی طریقے سے مچھلی شکار کر کے لاتے ہیں جبکہ ملکی اور غیر ملکی ٹرالر اور بڑے بڑے لانچ بلوچستان کی سمندری حیات کا بڑی بے دردی سے شکار کرتے ہیں۔ اور ماڑہ ایک نیوی فوجی اڈہ ہے اور وہاں پر فوجیوں کے واٹر بیس کیمپ موجود ہیں۔ باقی سمندر اور ساحلی علاقہ پسماندہ اور پراگندہ ہے اور مقامی لوگوں کو ان

میگا پروجیکٹس سے کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہورہا بلکہ وہ اپنی آبائی زمینوں سے بھی محروم ہوتے جارہے ہیں جبکہ دیگر علاقوں سے لوگوں کو وہاں لاکر بسایا جارہا ہے جس سے یقیناً مقامی آبادی پر اس کے منفی اثرات مرتب ہورہے ہیں اور ان کو ایک سازش کے تحت اقلیت میں تبدیل کرنے کی سازش کی جارہی ہے۔ گوادر میں جو پروجیکٹ شروع کیا گیا ہے اس پر بلوچستان کے لوگوں کی بڑی اکثریت کے تحفظات اور خدشات ہیں یہی وجہ ہے کہ بلوچستان میں امن عامہ کی صورتحال روز بروز خراب اور ابتر ہوتی جارہی ہے اور حقیقی قوم پرستوں کی جانب سے اس منصوبے کی جسے وہ اپنی ہلاکت سے تعبیر کرتے ہیں شدید مخالفت کی جارہی ہے اور اس سلسلے میں حکومت سمیت تمام سرمایہ کاروں کو بھی سخت پریشانی اور پچھتاوے کا سامنا ہے گوادر بندرگاہ کی پیداوار سے بلوچستان کو کوئی بھی فائدہ نہیں بالکل گیس اور تانبا کے پروجیکٹس کی طرح۔

حوالہ جات

1. جسٹس خدا بخش بجارانی مری، سرچ لائٹس آف بلوچیز اینڈ بلوچستان، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ، 1985، تھرڈ ایڈیشن، 2

2. ایضاً، 2

3. ایضاً، 3

4. ایضاً، 2-1

5. جان محمد دشتی، این ایسے آن بلوچ نیشنل سٹرگل ان پاکستان، گوشہ ادب، کوئٹہ، ندارد، 2,3

6 عنایت اللہ بلوچ، دی پرابلم آف گریٹر بلوچستان، اے کیس سٹڈی آف بلوچ نیشنلزم، جی ایم بی ایچ، سٹٹ گرٹ، جرمنی، 1987، 19

7. میر احمد یار خان، بلوچ قوم کے نام خان بلوچ کا پیغام، عباسی پریس، کراچی، 1972، 20

8. منیر احمد مری، بلوچستان سیاسی کشمکش، مضمرات و رجحانات، گوشہ ادب، کوئٹہ، 1989ء، 19-20

9. محمد ظہیر الدین بابر (خود نوشت سوانح حیات)، تزک بابری، مترجم، رشید اختر ندوی، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، 1999، 267

10. آغا نصیر خان احمد زئی، تاریخ بلوچ و بلوچستان (جلد دوئم)، بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، 1982ء، 7

11. میر گل خان نصیر، کوچ و بلوچ، سیلز اینڈ سروسز، کوئٹہ، 1999، 24,25

12. سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، دانیال پبلشرز، کراچی، 2002، 85

13. تورا کینہ قاضی، سائرس اعظم، شاہکار فاؤنڈیشن، کراچی، سال اشاعت ندارد، 267، 47، 146

14. ہیرلڈلیم، سکندر اعظم، مترجم: مولانا غلام رسول مہر، فکشن ہاؤس، لاہور، 2006، سیکنڈ ایڈیشن، 33-332

15. ونسنٹ اے سمتھ، دی آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، 1992 چوتھا ایڈیشن، 97

16. جی۔ لی سٹرینج، جغرافیہ خلافت مشرقی، مترجم: محمد جمیل الرحمان، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1986، 482

17. اعجاز الحق قدوسی، تاریخ سندھ جلد اول، اردو سائنس بورڈ، لاہور، 1976، سیکنڈ ایڈیشن، 331

باب سوئم

معدنی وسائل

بلوچستان اگرچہ زیادہ تر پہاڑی اور چٹیل خطہ زمین ہے اور یہاں پانی اور سبزے کی قلت ہے اور جنگلات نہ ہونے کے برابر ہیں تاہم قدرت نے بلوچستان کو ایسے انمول خزانوں سے نوازا ہے کہ جنکے بغیر موجودہ دور میں کوئی ملک باقی رہنے اور باقی دنیا کے ساتھ چلنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ خطے کی ترقی کا تمام تر دارومدار موجودہ دور میں انہی نعمت خداوندی یعنی معدنیات اور معدنی وسائل پر ہے۔ بلوچستان میں پیٹرولیم، گیس، سونا، چاندی، لوہا، کوئلہ، تانبا، کرومائیٹ، یورینیم اور سنگ مرمر سمیت سینکڑوں اقسام کی معدنی وسائل پائے جاتے ہیں۔ بلوچستان کی معدنیات اتنی اہم ہیں کہ یہ معدنی ذخائر بلوچستان کی اہمیت میں اہم ترین کردار ادا کر رہے ہیں اور بالادست قوتوں کی نظریں اسی لئے بلوچستان پر مرکوز ہیں تاکہ یہاں کی بے شمار معدنی ذخائر اور ہیرے جواہرات کے پہاڑوں کو وہ اپنے خطے میں منتقل کر سکیں۔ بلوچستان کی معدنیات پر ذیل میں مختصراً روشنی ڈالی جا رہی ہے۔

ا۔ **قدرتی گیس:** 1952ء میں سوئی کے مقام پر گیس دریافت ہوئی۔ ملک سعید دیوار لکھتا ہے کہ یہ بگٹی کے علاقہ میں سوئی کے مقام پر حاصل کی جا رہی ہے اور تقریباً پنجاب کے تمام شہروں تک پائپ لائنوں کے ذریعے پہنچائی گئی ہے سندھ اور سرحد بھی اس سے استفادہ کر رہے ہیں۔1 جبکہ بلوچستان میں یہ صرف کوئٹہ اور مستونگ تک پہنچائی گئی ہے جبکہ حال ہی میں پشین اور قلات کے چند مخصوص علاقے بھی اس سے استفادہ کرنے لگے ہیں۔

لیفٹیننٹ کرنل سید اقبال احمد رقمطراز ہے کہ

Balochistan has large reserves of natural gas. The four principal fields are sui, with initial reserve estimates of 6.3 million cubic feet by (MCF) and in the revised is 8.62 (MCF) followed by Pirkoh with 4 trillion cubic feet (TCF) and then Uch 2.5 MCF and Zin with 0.1 MCF, these four gas from a quardrangle in Dera Bugti and with a total reserve to exceed the out put of the remaining eight gas fields of Pakistan. The fifth gas field of Marri is located in Kohlu Agency with total reserve of 3.942 MCF. The largest reserve is of Sui gas field. It is being delivered in the entire Pakistan through Sui - Quetta, Sui Multan-Peshawar and Sui-Karachi gas lines. Sui Quetta line is the shortest in distance but the laying cost with the highest with an expenditure of over 700 million rupees. Its laying was more political reasons then commercial. The break down of utilistation of gas is: power 40%, cement 18% fertilizer 14% other industries 26% and commercial and domestic consumers 2% of the total gas. The gas consumption at the rate of 786 MCF per day has accounted to about 1/3rd deplation of the estimated reserve. Its maximum use from a single source makes it a vital fuel supply for pakistan.2

مندرجہ بالا گیس فیلڈز کے علاوہ ضلع خضدار کی تحصیل مولہ میں گیس کے وسیع ذخائر دریافت ہوئے ہیں اور جھل مگسی میں گیس کے ذخائر کی دریافت کے بعد شہدادکوٹ میں پلانٹ لگا کر اس سے استفادہ کیا جا رہا ہے۔ ان کے علاوہ بھی وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ مکران اور چاغی میں اس کے وسیع ذخائر موجود ہیں اور بلوچستان کے دیگر علاقے بھی قدرتی گیس کے ذخیروں سے

خالی نہیں۔

۲۔ تیل: بلوچ خطہ زمین تیل کے وسیع ذخائر سے مالا مال ہے تمام ریگستانی اور ساحلی خطے کے علاوہ کوہلو و ڈیرہ بگٹی کے کوہ ودمن بھی تیل کے سمندر کے اوپر تیر رہے ہیں۔ ایک مصنف لکھتا ہے کہ

Besides the gas occurrences there are several oil seeps in Balochistan. The Khattan oil seep 40 miles east of Sibi produced about 8 lacks barral of oil in 1886 to 1894, but then it became uneconomical probably more oil was discovered in other areas like Burma at a cheeper cost. In Balochistan the prespect of discovery of oil is fairly good. Infact the geological structure in regional setting supports all the possibility of finding oil in Balochistan. The previous topographical study of Balochistan assist us in understanding that area lies with in a system of mountains and geological structure that is similar to world's principal oil bearing area such as the middle east and Indonesia. Secondly it is surrounded by oil producing areas chiefly Iran, Saudi Arabia, the gulf states to invest in the north punjab and in the south the newly discovered oil fields of Badin in Sindh. Thirdly Pakistan's largest oil fields are found in Balochistan. In the Mekran Coast the oil prospects are fairly bright as it links up with off shore oil fields of Muscat and newly discovered oil fields of can bay off Bombay in India.3

علاوہ ازیں کوہلو بارکھان، کاہان، ڈیرہ بگٹی، چاغی کے ریگستانوں اور مکران کے سمندروں میں تیل کے وسیع ذخائر دریافت ہو چکے ہیں اگر ان کا تخمینہ لگایا جائے تو بلوچستان دنیا کا تیل

پیدا کرنے والا کویت کے بعد دوسرا بڑا خطہ ہوگا۔

3. **کوئلہ:** کوئلہ کا استعمال نہ صرف بطور ایندھن ہوتا ہے بلکہ اسے مزید ایندھن کے حصول کیلئے بھی استعمال میں لایا جاتا ہے اس سے بجلی حاصل کی جاتی ہے اور کارخانے، فیکٹریاں، ریلوے انجن اور دیگر بہت ساری ضروریات پوری کرنے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ معدنیات کی یہ اہم ترین قسم کے وسیع ذخائر بلوچستان میں سنجدی، دکی، پچھ (ہرنائی)، مچھ، آب گم، جوہان، سورنج، ڈیگاری، کھوسٹ، شاہرگ اور مارواڑ وغیرہ میں موجود ہیں جن سے برطانوی عہد سے بیرونی خطے کے لوگ استفادہ کررہے ہیں۔ اس کے علاوہ چمالنگ کے کانوں سے روزانہ ہزاروں ٹن کوئلہ دیگر علاقوں کو بھیجا جارہا ہے حتیٰ کہ ان کوئلہ کانوں میں ٹھیکیدار اور مزدور باہر سے لائے جاتے ہیں تاکہ عام لوگوں کو اس اہم ترین خزانے کی قیمت اور اہمیت کا اندازہ نہ ہوسکے بلوچستان کے کوئلے کو بطور ایندھن مختلف جگہوں پر استعمال میں لایا جاتا ہے مصنف کرنل سید اقبال احمد لکھتا ہے کہ

Balochistan is fortunate in fuel resources. Besides gas it has large resources of coal. It is the only mineral product in large quantities and the next most important source developed by the British in 1877. 4

4. **تانبا:** تانبا زمانہ قدیم سے انسانی استعمال میں ہے اور دور جدید میں شاید ہی کوئی شخص اس کے استعمال یا اہمیت سے آگاہ نہ ہو۔ عام طور پر یہ دھات بجلی کے سامان وغیرہ میں استعمال ہوتا ہے مگر اسکا استعمال وسیع پیمانوں پر ہوتا ہے۔ ظروف سازی اور آرائشی اشیاء بھی اس سے بنائے جاتے ہیں اور اس کے علاوہ یہ بڑی بڑی صنعتوں میں بھی کثرت سے استعمال ہوتا ہے لیفٹننٹ کرنل سید اقبال احمد کے الفاظ میں۔

Amongst the principal metallic minerals the discovery of Saindak copper deposits in 1962 has been the most promising. It has been the chance discovery by the study of NASA, USA which was passed on to the Government of Pakistan and Iran.

The Saindak Copper bearing rocks are spreading in the area upto Sar chashmeh in the Iran but most of it is in Balochistan. The copper ore is of high grade and also have gold, silver, pyrite, magnetic and molybdenum. It has a reserve of 412 Million tons and site value of integrated minerals of over us $ 9 Billion. The Saindak mines could have daily out put of 12,600 tones per year, where as Molybdenum will be exported with out further treatment. The water supply has been made available from Hamun Mashkel for sixty years with rechange. The ambitious project is in the lurch due to lack of capital.5

سیندک کے علاوہ ریکوڈک (چاغی) میں سونے، چاندی اور تانبے کے وسیع ذخائر دریافت ہوئے ہیں۔ ریکوڈک میں دریافت ہونے والی معدنیات میں سونے کی مقدار زیادہ اور تانبے کی کم ہے یعنی دوسرے الفاظ میں وہاں سونے کے ذخائر دریافت ہوئے ہیں مگر تاریخ گذشتہ کو یہاں بھی دہرائی جارہی ہے اور ان ذخائر سے بلوچستان کی بجائے بالادست قوتیں شکم سیر ہورہی ہیں جس کی وجہ سے نہ صرف چاغی بلکہ پورے بلوچستان کے عوام میں مایوسی اور محرومی پائی جاتی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کے سونے چاندی اور ہیرے جواہرات کے ذخائر کا کیا بن رہا ہے؟ اور انھیں ان قیمتی وسائل کو لٹانے کے بدلے کیا مل رہا ہے؟

۵۔ **سنگ مرمر:** سنگ مرمر کا استعمال پوری دنیا میں ہوتا ہے اور ہر شخص اسکی خوبصورتی اور اہمیت سے آگاہ ہے۔ عمارتوں کی خوبصورتی، تفریحی مقامات کی آرائشی اشیاء تک سنگ مرمر سے بنائی جاتی ہیں۔ بلوچستان تقریباً ہر رنگ کے حسین اور خوبصورت سنگ مرمر (مرمریں پتھر) کی دولت سے مالا مال ہے اور خاص کر گرین ماربل (ONYX) کے وسیع ذخائر چاغی میں پائے جاتے ہیں جن کی پوری دنیا میں سب سے زیادہ مانگ ہے۔ چاغی میں سنگ مرمر کی کانوں سے سالانہ 48 ہزار 591 ٹن سنگ مرمر نکال کر کراچی لے جایا جارہا ہے جہاں سے یہ قیمتی پتھر باہر ممالک اٹلی، فرانس وغیرہ بھیجا جاتا ہے۔ چاغی کے علاوہ لسبیلہ اور جھالاوان (خضدار)

میں بھی سنگِ مرمر کے وسیع ذخائر موجود ہیں۔

۶۔ **لوہا:** زمانہ قدیم سے انسان کے زیر استعمال ہے لیکن اس کی افادیت اور اہمیت میں کوئی کمی نہیں آئی بلکہ روز افزوں اس کے استعمال میں اضافہ ہو رہا ہے اور اسکی ضرورت بڑھ رہی ہے۔ گھریلو سوئی سے لیکر خلائی جہاز تک میں اس اہم ترین معدن کا استعمال ہوتا ہے۔ اس دھات کے وسیع ذخائر چاغی اور خضدار میں پائے جاتے ہیں. بلوچستان میں اس اہم ترین معدن کے کروڑوں ٹن کے ذخائر موجود ہیں۔

۷۔ **گندھک:** یہ بھی ایک انتہائی اہم معدن ہے جو مختلف اشیاء مثلاً مختلف اقسام کے تیزاب، کیمیائی کھادوں کی تیاری بمعہ گولہ بارود کی تیاری، لوہے کی صنعت، پیٹرولیم کی صنعت، ٹیکسٹائل کی صنعت، تارکول، رنگ و روغن کی تیاری وغیرہ میں استعمال ہوتا ہے۔ بلوچستان میں اس کے وسیع ذخائر لسبیلہ، کچھی، قلات، مکران، چاغی وغیرہ میں موجود ہیں۔ جبکہ کوہ سلطان (چاغی) کا نوے (90) میل طویل پہاڑ گندھک کا پہاڑ ہے جس سے دوسری جنگ عظیم کے دوران برطانیہ نے خوب استفادہ کیا تھا۔

۸۔ **سیسہ:** یہ بھی ایک قیمتی دھات ہے اور مختلف اشیاء مثلاً بیٹریوں، کیبلز، سیسے کے پائپوں، آتشیں گولیوں، اسلحہ سازی، رنگ و روغن وغیرہ کے بنانے میں کام آتا ہے۔ اس کے ذخائر لسبیلہ، چاغی اور خضدار میں پائے جاتے ہیں۔

۹۔ **کرومائیٹ:** یہ اہم ترین معدن محرک قدوم کی اینٹوں، بھٹیوں کے استر اور کرومیم لوہے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کٹائی کے اوزار اور زرہ بکتر کی پلیٹیں بھی اس سے تیار کی جاتی ہیں۔ لوہے کی صنعت میں اسکا استعمال اس بناء پر زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ اس سے لوہے کو زنگ زدگی سے محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ اس سے رنگ و روغن کی تیاری میں بھی کام لیا جاتا ہے۔ اس کے وسیع ذخائر ژوب، مسلم باغ، خضدار اور چاغی میں پائے جاتے ہیں۔

۱۰۔ **انٹی مونی:** یہ مختلف اقسام کے آمیزوں اور نمکیات کی تیاری میں کام آتا ہے سخت سیسہ دراصل سیسہ اور انٹی مونی کا آمیزہ ہے انٹی مونی اس قسم کی اشیاء کو سخت بنا دیتی ہے جو بیٹری کی پلیٹوں، تیزاب کے حجیروں کی چادروں، سیسے کی کیمیائی پائپوں، کھلونوں، کیبل کے پوش، سائفن کی ٹیکیوں، جوہری اوزاروں اور بندوق کی گولیوں کے نوکیلے حصہ کی تیاری میں

استعمال ہوتا ہے۔ یہ کوئٹہ اور قلعہ عبداللہ خان میں پایا جاتا ہے جبکہ خضدار اور چاغی میں بھی اسکی نشاندہی ہوئی ہے۔

۱۱۔ **مینگانیز:** ابتداء میں اس معدن کو دواؤں اور رنگوں کی تیاری میں استعمال کیا جاتا تھا بعدازاں اسے لوہے کی صنعت میں اہم حیثیت حاصل ہوگئی۔ اس کے استعمال سے لوہے سے نقصان دہ اجزاء یعنی آکسیجن اور گندھک کے آمیزے نکل جاتے ہیں اس طرح اسکی اہمیت بڑھ گئی۔ اسکے اور نکل کی آمیزش سے جو دھات بنتی ہے اس کو ہوائی جہازوں کی تیاری میں استعمال کیا جاتا ہے۔ پیتل کے ملاپ سے جو آمیزہ تیار کیا جاتا ہے اسے پانی کے حوضوں کو کٹاؤ سے محفوظ رکھنے کیلئے استعمال میں لایا جاتا ہے، اسے بھاپ سے چلنے والی انجنوں (دخانی جہازوں) کی تیاری میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے وسیع ذخائر لسبیلہ، چاغی اور ژوب میں پائے جاتے ہیں۔

۱۲۔ **زنک:** یہ اہم ترین معدن لوہے کی صنعت، کانسی، سلور اور ربڑ وغیرہ کی صنعتوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اسکے ذخائر، چاغی، قلات، دالبندین اور زیارت میں پائے جاتے ہیں۔

۱۳۔ **نکل:** یہ اہم ترین معدن ہے جسکا استعمال وسیع پیمانے پر ہوتا ہے۔ برتنوں کی پالش، لوہے کے پائپوں کی پالش اور انھیں زنگ سے محفوظ رکھنے کیلئے، مختلف مشینریوں میں اسکا استعمال، اوزاروں اور انجینئرنگ میں اسکا استعمال اور زرہ بکتر کے پلیٹوں کی تیاری کے علاوہ ہتھیاروں میں بھی اسکا ستعمال ہوتا ہے۔ اس کے وسیع ذخائر لسبیلہ اور ژوب میں پائے جاتے ہیں۔

۱۴۔ **اسبسٹوس:** یہ ایک قیمتی اور ریشہ دار دھات ہے جو جلنے سے محفوظ ہے۔ یہ مختلف اقسام کی صنعتوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اسکے وسیع ذخائر مسلم باغ میں پائے جاتے ہیں اور دیگر کئی جگہوں سے بھی اسکی موجودگی کے شواہد ملے ہیں۔

۱۵۔ **بمائیٹ:** بہترین قسم کا برائیٹ کوہ سلطان (چاغی) میں پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ لسبیلہ، خضدار اور قلات میں بھی اسکی اعلیٰ قسم کے وسیع ذخائر دریافت ہوئے ہیں۔ برائیٹ کا سب سے اہم استعمال نیوکلیئر ٹیکنالوجی کی عمارتوں میں کیا جاتا ہے جس سے عمارت کئی گنا زیادہ محفوظ ہو جاتی ہے علاوہ ازیں عام عمارتوں میں بھی اسکا استعمال کیا جاتا ہے۔ بورنگ مشینوں، شیشے

کی صنعتوں اور دیگر کئی جگہوں پر اسے زیر استعمال لایا جاتا ہے۔ خضدار میں اس کے وسیع ذخائر دریافت ہوئے ہیں۔

۱۶۔ **فلورائیٹ:** یہ دھات لوہے، شیشہ سازی کی صنعتوں اور برتنوں پر پالش کے کام آتا ہے۔ اس سے تیزاب بھی بنتا ہے اور آرائشی پتھر کے طور پر زیورات میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اسکے وافر ذخائر قلات اور مکران میں پائے جاتے ہیں اور کئی دیگر علاقوں میں بھی اسکی دستیابی ممکن ہے۔

۱۷۔ **سوپ سٹون:** اس اہم ترین معدن کا استعمال بھٹوں، ٹائلوں، ربڑ اور مٹی کے برتن بنانے، ٹیکسٹائل کی صنعت، کاسمیٹکس، جوتوں کی پالش اور نیل پالش وغیرہ میں ہوتا ہے۔ اسکے ذخائر ژوب میں پائے جاتے ہیں۔

۱۸۔ **فاسفیٹ:** اس فاسفورس کا تیزاب بنایا جاتا ہے جو کیمیائی کھادوں کی تیاری کیلئے اہم ترین عنصر ہے۔ اس کے معمولی ذخائر ژوب میں پائے جاتے ہیں۔

۱۹۔ **گریفائیٹ:** اس اہم پتھر کا استعمال کٹھالیوں، سٹو پالش، بھٹیوں، سیسہ کی پنسلوں، سیمنٹ کی چکنائی وغیرہ کے کام آتا ہے۔ یہ مستونگ میں شیخ واصل کے مقام پر پایا جاتا ہے۔

۲۰۔ **میگنیسائیٹ:** یہ لوہے کی صنعت میں استعمال ہونے والا اہم ترین عنصر ہے جو خضدار، ژوب اور لسبیلہ میں پایا جاتا ہے۔

۲۱۔ **سٹرونشیم:** یہ ایک اہم دھات ہے جس کے بارے میں لیفٹیننٹ کرنل سید اقبال احمد یوں لکھتے ہیں کہ

A bolder of elestite, the most common ore of storfium was Ras Koh range and in 9 stream near Chunary about 12 miles east of Lasbela . Storntium is an important mineral used in paints, as a substitute for Barite as subber filler and in oil drilling muel. The main use is nor in pyroellectrics and chemcial industry rather then in metallurgy. It had its military

use as in tracer bullets distress signals and military signals flaresand might illuminuatin rockets etc. 6

۲۲۔ **جپسم:** یہ بھی ایک انتہائی اہم معدن ہے جو سیمنٹ کی تیاری اور کھل کی صنعت میں کام آتا ہے۔ بلوچستان میں اس اہم ترین اور ضروری معدن کے وسیع ذخائر پائے جاتے ہیں۔ صرف چاغی میں اس معدن کے 24 مقامات سے لاکھوں ٹن کے ذخائر دریافت ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ سبی، بولان، کیرتھر، کچھی اور لسبیلہ میں اس کے وسیع ذخائر موجود ہیں۔

۲۳۔ **خوردنی نمک:** بلوچستان میں جہاں کھارے پانی کی جھیلیں پائی جاتی ہیں اور جن میں بارش کا پانی جمع ہوتا رہتا ہے وہاں سے خوردنی نمک حاصل کیا جاتا ہے۔ لسبیلہ، مکران، چاغی اور خاران میں ایسی جھیلیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں مکران اور لسبیلہ کی ساحلی پٹی کے لوگ سمندر سے نمک حاصل کرتے ہیں۔

۲۴۔ **لائم سٹون:** لائم سٹون یعنی چونا پتھر کے وسیع ذخائر بلوچستان کے ہر پہاڑی سلسلے میں پایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اس سے خوبصورت ٹائلیں بھی بنائی جاتی ہیں اور آرائشی اشیاء بھی۔

۲۵۔ **تعمیراتی پتھر:** اسے ریلوے لائنوں کی تعمیر، سڑکوں کی تعمیر، پلوں کی تعمیر، بندات کی تعمیر، عمارات کی تعمیر وغیرہ میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ علاوہ ازیں بہت ساری دیگر ضروری گھریلو استعمال کی اشیاء اور زیبائش و آرائش کیلئے بھی زیر استعمال لایا جاتا ہے یہ پتھر بلوچستان کے تمام پہاڑی علاقوں میں پایا جاتا ہے۔

۲۶۔ **سینڈ سٹون:** اس اہم عمارتی استعمال کے پتھر کے بھی وسیع ذخائر بلوچستان کے ہر پہاڑی منطقے میں پائے جاتے ہیں۔

۲۷۔ **گلاس سٹون:** یہ اہم ترین پتھر لورالائی، ژوب اور کوئٹہ میں پایا جاتا ہے۔

۲۸۔ **فلیڈ سپر:** اس دھات کے وسیع ذخائر راس کوہ (چاغی) اور خانوزئی (پشین) میں دریافت ہوئے ہیں۔

۲۹۔ **گارنیٹ:** گارنیٹ پتھر آرائشی اشیاء، زیورات وغیرہ اور گھریلو اشیاء کی تیاری میں استعمال ہوتا ہے۔ اس پتھر پر مزید تحقیق کی جا رہی ہے اس کے وسیع ذخائر راس کوہ میں پائے

جاتے ہیں۔

۳۰۔ **ڈرمیکولائیٹ:** یہ اہم ترین معدن گھروں کی انسولیشن، فریج، سائیلنسر پلاسٹر، گاڑیوں کی انسولیشن، کولڈسٹوریج، آگ بجھانے والے مواد، گریس بنانے، ربڑ کی اشیاء بنانے، پلاسٹک بنانے، فلموں کے فائر پروف کارٹن بنانے، سونا اور چاندی پر لکھائی کا پیسٹ وغیرہ کی صنعتوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس اہم ترین معدن کے وسیع ذخائر چاغی میں پائے جاتے ہیں۔

۳۱۔ **میکیسائیٹ:** یہ معدن لوہے کی صنعت میں استعمال ہوتا ہے اور لوہے کی صنعت میں ایک اہم عنصر کے طور پر کام کرتا ہے اس کے ذخائر خضدار، لسبیلہ اور ژوب میں پائے جاتے ہیں۔

۳۲۔ **کھریا مٹی:** یہ کیمیائی کھاد، شیشہ سازی اور چینی کے برتنوں کی تیاری اور سیمنٹ کی صنعت میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ لورالائی، سبی، بولان، چاغی حتیٰ کہ ہر جگہ پایا جاتا ہے۔

۳۳۔ **آلم Alum:** اسکی معمولی مقدار ضلع چاغی میں کوہ سلطان سے دریافت ہوئی ہے اس کے علاوہ کچھی میں سنی کے میدانوں میں بھی پایا جاتا ہے۔

۳۴۔ **کالسائیٹ:** یہ چونے کے پتھر سے ملتا جلتا ایک دھات ہے جو انہی مقاصد کیلئے استعمال ہوتا ہے اور اس سے رنگ وروغن کی تیاری کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ اس کے ذخائر بھی چاغی میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ژوب میں بھی اس کے ذخائر موجود ہے۔

۳۵۔ **اوکرس:** رنگ وروغن کی صنعت وغیرہ میں اسکا استعمال ہوتا ہے۔ اس کے معمولی ذخائر ژوب میں پائے جاتے ہیں۔

۳۶۔ **ریت:** یہ تعمیرات کیلئے سب سے اہم ترین عنصر کے طور پر استعمال ہوتا ہے یہ بلوچستان کے تمام پہاڑی ندی نالوں میں پایا جاتا ہے۔

۳۷۔ **سونا:** سونے کے استعمال اور اہمیت سے کون آگاہ نہیں ہے۔ زمانہ قدیم سے یہ اہم ترین دھات انسانی استعمال میں ہے اور اسے امارت کی نشانی سمجھی جاتی ہے۔ یہ بلوچستان کے کئی مقامات پر دریافت ہوا ہے۔ مگر فی الحال ریکوڈک اور سیندک جو کہ چاغی میں واقع ہیں سے نکالا جارہا ہے علاوہ ازیں یہ بولان میں بھی پایا جاتا ہے اور اس کے مزید ذخائر بھی موجود ہیں۔

۳۸۔ **چاندی:** یہ بھی سونے کی طرح اہم اور قدیم دھات ہے جو زیورات، برتن اور

دیگر آرائشی اشیاء کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ یہ بھی سیندک اور ریکوڈک چاغی میں پایا جاتا ہے۔

درج بالا سطور میں صرف ان چند معدنیات کا تذکرہ کیا گیا جن کے بارے میں عام طور پر کتابوں میں مذکور ہے ورنہ جس طرح شروع میں عرض ہوا کہ بلوچستان میں 510 اقسام کی معدنیات پائی جاتی ہیں اور دور جدید میں انہی معدنیات کی دریافت اور ضرورت نے بلوچستان کی علاقائی اہمیت میں مزید اضافہ کیا ہے کیونکہ ہیرے جواہرات سے مزین یہ سرزمین اتنا امیر ہے کہ پورے پورے پہاڑ اور پہاڑی سلسلے انمول اور قیمتی پتھروں سے بنے ہیں۔ ان معدنیات سے مالا مال پہاڑوں کی بیرونی سطح بھی اتنی خوبصورت، منقش اور حسین ہوتی ہے کہ ان کو دیکھ کر بے اختیار یہ الفاظ دل سے زبان پر آجاتے ہیں۔

" کہ اللہ تعالیٰ نے بڑی ہی فرصت اور دلچسپی کے ساتھ اس خطہ زمین کو بنایا ہے اور اسے اتنے رنگ عطا کئے ہیں کہ یہ بلاوجہ موسموں، پھولوں، پھلوں، زبانوں، نسلوں، تہذیبوں اور خوبصورت و حسین پتھروں کا گلدستہ کہلانے کا مستحق ہے"۔

حوالہ جات

1. نصیر میمن، آئل اینڈ گیس ریسورسز اینڈ رائٹس آف پروڈنس، سی پی سی ایف، 2010، 3 و محمد سعید دہوار، تاریخ بلوچستان، نسداہ ٹریڈرز، کوئٹہ، 1990، 44

2. سید اقبال احمد (لیفٹننٹ کرنل)، بلوچستان اٹس سٹریٹجک امپورٹنس، رائل بک کمپنی، کراچی، 1992، 392

3. ایضاً، 93-392

4. ایضاً، 393

5. ایضاً، 393

6. ایضاً، 395

باب چہارم

بلوچستان کے سیاسی اداوار کا مختصر پس منظر

بلوچستان، جس کا تعارف پچھے اوراق میں تفصیل کے ساتھ ہو چکا ہے۔ اپنی بے پناہ طبعی خوبیوں اور خصوصیات کی وجہ سے ماضی قدیم سے آج تک ہر طرح کی اہمیت کا حامل چلا آرہا ہے۔ آریاؤں کے حملوں سے بہت پیشتر تقریباً عراقی سمیریوں کے ابتدائی دور سے بھی قبل یہاں انسانوں کی آبادیاں رہی ہیں۔ بلوچستان میں چاروں اطراف میں پھیلے ہوئے لاتعداد مٹی کے ٹیلے (دمب Mounds) اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ بلوچستان کے لق و دق صحرائی و پہاڑی خطہ کبھی بھی انسانوں کے وجود سے خالی نہیں رہا۔1 گو کہ یہاں پر کسی بڑی تہذیب نے جنم نہیں لیا۔ لیکن مقامی سطح پر موجود ثقافت و علاقائی تہذیب وسیع و عریض جغرافیائی حدود میں پھیلی ہوئی تھی۔ دریافت شدہ آثار قدیمہ کے مطابق تہذیب و تمدن کا یہ انسانی سفر تقریباً گیارہ ہزار سال قدیم ہے۔ مہر گڑھ (بولان) اور بلوچستان کے دیگر حصوں سے برآمد ہونے والے تہذیبی آثار اور اشیاء اس بارے میں مصدقہ خبر دیتے ہیں۔ دنیا کے دیگر خطوں اور خصوصاً برصغیر سے جنم لینے والی تہذیبوں کا پیشرو بلوچستان کی یہی قدیم تہذیب تھی۔ گو کہ بلوچستان کی قدیم تہذیب بلوچستانی خطے میں پنپ نہ سکی اور وہ زندگی کے قدیم معاشرتی اصولوں کے تحت قائم و دائم رہی مگر مشرق و مغرب میں بڑی بڑی تہذیبوں نے وسائل کی فراوانی کی وجہ سے جنم لیا، ترقی کی اور بلوچستان کی قدیم تہذیب کو متاثر کرتے رہے۔ لہٰذا بلوچستان کی قدیم ثقافتی زندگی مشرق کی قدیم دراوڑ تہذیب اور ایران کی آرین اور قبل از آرین تہذیبوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ بعد میں آنے والے ہر حملہ آور قوت بلوچستان کی مقامی آبادی پر اپنی تہذیبی، ثقافتی، معاشرتی، اور نفسیاتی

نقوش چھوڑتا گیا۔

بلوچستان ہمیشہ سے مشرق و مغرب کے درمیان ایک سنگم کی حیثیت میں رہا ہے اس کی زمینی طبعی ساخت نہ تو ہندوستان کے پلیٹو سے ملتا ہے اور نہ ہی مکمل طور پر ایرانی زمینی پلیٹو کی ہم شکل ہے۔ البتہ بلوچستان کا صحرائی خطہ جو کہ مغربی بلوچستان پر مشتمل ہے۔ ایرانی پلیٹو کا ایک حصہ ہے۔ جبکہ پہاڑی خطے کی شباہت وسط ایشیائی پلیٹو جیسی ہے۔ ورنہ یہ پورا خطہ جسکا کل رقبہ تین لاکھ پچاس ہزار سے لیکر چار لاکھ مربع میل بنتا ہے اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ گو کہ موجودہ دور میں معدنی اور دیگر معاشی وسائل کی فراوانی کی وجہ سے بلوچستان کی اہمیت میں گوناگوں اضافہ ہوا ہے۔ مگر ماضی قدیم میں بلوچستان کی حیثیت ایک کراس روڈ کی سی تھی۔ فوجی نقطہ نگاہ سے اس خطے کی اہمیت ہمیشہ مسلم رہی ہے اور ماضی قدیم سے زیادہ تر اسی مقصد کی خاطر استعمال ہوتا رہا ہے۔ اس کے بلند و بالا پہاڑ اور وسیع میدان دفاعی نقطہ نگاہ سے انتہائی اہم خیال کئے جاتے ہیں جبکہ اونچے پہاڑ وادیوں کے لئے قدرتی فصیل اور مورچوں کا کام دیتے ہیں بقول خان معظم میر احمد یار خان

> "بلوچستان کو اس کے جغرافیائی اہمیت اور سرحدی محل وقوع کے اعتبار سے ایشیاء میں ایک اہم ترین بفر اسٹیٹ کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اس لئے بلوچوں کو ہمیشہ اپنے سے زیادہ طاقتور اور باجبروت حکومتوں سے ٹکرانا پڑا ہے۔ بلوچوں نے آرام سے بیٹھ کر کبھی بزم آرائی نہیں کی بلکہ میدان رزم کی گرم بازاری ہی ان کے حصے میں آتی رہی ہے اور انہوں نے اپنی ساری زندگی مدافعانہ جنگ و جدل میں گزار دی ہے۔2

معلوم تاریخ میں سب سے پہلے آریائی حملوں کا پتہ چلتا ہے جنہوں نے شمال اور شمال مشرق کی سمتوں سے ایران پر حملے شروع کئے تو راستہ میں ان حملہ آوروں کا ٹکراؤ بلوچ قبائل سے ہوا۔ ان قبائل نے صدیوں تک آریاؤں کا مقابلہ کیا اور انھیں ایرانی اور بلوچ خطے میں داخل ہونے سے روکتے رہے۔ بقول تورا کینہ قاضی انتہائی شمالی اور شمال مغربی بلوچستان (بحیرہ خزر) ہیرکانیہ کے ہیرکانی، ایری اور دیگر سینکڑوں بلوچ قبائل ان بیرونی حملہ آوروں سے لڑتے رہے 3 جبکہ دوسری طرف آریاؤں کے کچھ جتھے سیستان اور افغانستان کے راستے بلوچستان میں وارد ہوئے اور برا

سے یونان عازم سندھ و ہند ہوئے اور سندھ تہذیب کا خاتمہ کر کے رکھ دیا۔ بلوچستان کی مقامی تہذیب کی تباہی کا سبب بھی یہی آریا حملہ آور تھے۔ ان آریائی قبائل کے چند جتھے مقامی آبادی کے اندر اس طرح ضم ہو گئے کہ اب ان کا سراغ لگانا ناممکن ہے لیکن زیادہ تر حملہ آور یہاں کی سخت موسمی کیفیتوں سے گھبرا کر سندھ و ہند کی طرف فرار ہو گئے اور سندھ تہذیب پر چھا گئے۔

بلوچستان ایک ایسا دور افتادہ ویران اور سنسان خطہ ہے جہاں مقامی آبادیاں زمانہ قدیم سے ایک مخصوص انداز میں دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ زیادہ تر پہاڑی وادیوں میں زمین دوز چشموں کے قریب یا کسی بہتے ہوئے نالے کے کنارے۔ ورنہ زیادہ تر خطہ بنجر و بے آب و گیاہ ہے لہٰذا کوئی بھی حملہ آور قوم یا حکومت و سلطنت یہاں ٹک کر حکومت نہیں کر سکا ہے۔

تاریخ کے زرین صفحات پر آریائی حملوں کے بعد بلوچستان پر عظیم آشوری ملکہ سمی رامس کے حملوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔4 ایران کے میدی حکمران (854ق م تا 558ق م) اور ہخامنشی خاندان (558ق م تا 331ق م) کے حکمران بھی اس علاقے کی اہمیت سے آگاہ تھے۔ لہٰذا انہوں نے یہاں قبضہ کرنا ضروری خیال کرتے ہوئے قدیم تورانی سلطنت کا خاتمہ کیا اور ہندوستانی آریائی سرحدوں تک اس خطے پر قبضہ کر لیا اور اسے ایک اہم فوجی چوکی کی حیثیت دی۔ ایرانی ہخامنشی فرمانروا سائرس اعظم (558 تا 530ق م) نے بھی اس خطے کی اہمیت کے پیش نظر اس کو فتح کر کے یہاں کے قبائل کو مطیع و فرمانبردار رکھنا ضروری خیال کیا۔ لیکن سائرس مکران کے ابتدائی سفر میں ہی اپنی فوج گنوا بیٹھا اور خود بمشکل سات سپاہیوں کے ساتھ ایران پہنچنے میں کامیاب ہوا۔5 دراصل سائرس کی فوج کی تباہی میں مکرانی خطے کی سخت آب و ہوا اور زبردست و خوفناک پہاڑی بھول بھلیوں کا کردار تھا۔ جس طرح نپولین ماسکو کی سردی اور برف باری میں فرانسیسی فوج کو تباہ کر بیٹھا اسی طرح سائرس بھی بلوچستان کے موسمی و جغرافیائی حالات کا شکار رہا اور بعد ازاں ہخامنشیوں نے پورے بلوچستان پر آہستہ آہستہ اپنا تسلط جما لیا اور اس کی فوجی حیثیت برقرار رکھی۔

سکندر اعظم کے بلوچستان کے سفر سے تاریخ کے مضمون کا ہر قاری واقف ہوگا۔ ہندوستان سے واپسی پر سکندر اعظم نے دریائے سندھ میں پٹالہ کے مقام سے اپنی فوج کو تین حصوں میں منقسم کیا۔ ایک حصہ اپنے سالار کریٹرس کے زیر کمان درہ مولہ کے راستے ایران کی جانب روانہ کیا۔

جبکہ دوسرا حصہ امیر البحر نیر وخس کے زیر کمان سمندر کے راستے ساحل مکران سے ہوتے ہوئے ایران کی جانب روانہ کیا۔ بعد ازاں ایک حصے کو جس میں سارے نامی گرامی جنگجو اور مہم جو سپاہی شامل تھے۔ سکندر اپنی کمان میں لیکر براستہ بیلہ و مکران عازم ایران ہوا۔ لیکن شاید سکندر کو مکران کی کلفتوں اور دشواریوں کا علم نہیں تھا کیونکہ جن تکالیف کا سکندر کو اس خطے میں سامنا کرنا پڑا بقول مورخ ایرین کے ایسی مشکلات کا سکندر نے شمالی علاقوں کی مہمات کے دوران بھی سامنا نہیں کیا تھا۔ اسی طرح نیر وخس کو سمندری راستے سے گزرتے ہوئے یہاں پر آباد ساحلی قبائل سے مقابلہ کرنا پڑا جنہوں نے نیر وخس کو بہت پریشان کیا۔ اور وہ سینکڑوں تکالیف کا سامنا کرتا ہوا بمشکل ایران پہنچ سکا تھا۔ لیکن سائرس کی طرح سکندر بھی اس خطے پر قبضہ کرنا ضروری خیال کرتا تھا لہٰذا اس نے اپنے اس مقصد کے حصول کی خاطر اس خطرناک سفر کی کمان خود اپنے ہاتھ میں لی اور مکران کو پامال کرتا ہوا بصد مشکل اسے فتح کر کے یہاں اپنا گورنر مقرر کیا۔6

سکندر کے بعد اس خطے کی اہمیت کے پیش نظر ہندوستان کے موریا اور ایران کے پارتھی اقوام نے بھی اسے اپنی مملکت میں شامل کئے رکھا۔ اور ہر قبضہ گیر کے لئے یہ خطہ ایک اہم فوجی سرحد و چوکی کی حیثیت رکھتا تھا۔ ساسانیوں کے ابتدائی دور میں یہاں ایران کا قبضہ برقرار رہا لیکن ایران پر عرب حملوں کے دوران سندھ کے رائے خاندان کے حکمران راجہ رائے چچ بن سلائج نے قبضہ کیا مگر 644ء میں عربوں نے سندھیوں کو شکست دے کر مکران اور بعد ازاں پورے بلوچستان اور سندھ پر قبضہ کرلیا۔ عربوں کا قبضہ تقریباً 400 سال برقرار رہا اس کے بعد غزنوی اور منگول حملہ آور اقوام بھی خطے کی علاقائی اور فوجی اہمیت کے پیش نظر یہاں پر قابض رہے۔ بالآخر 1410ء میں ایران اور وسط ایشیاء میں منگول اقتدار کا خاتمہ ہوا اور یہاں کے حقیقی باشندوں یعنی بلوچوں نے اپنی جداگانہ حکومت کا آغاز کیا جو 1948ء تک تقریباً 538 سال قائم رہنے کے بعد اپنے انجام کو پہنچا۔ گو کہ اس دوران پرتگیزی، ولندیزی، ایرانی اور افغان اقوام نے بھی اس خطے پر اپنی نظریں گاڑھی ہوئی تھیں مگر ان کو اپنے قدم جمانے کا موقع نہ مل سکا۔ 1839ء میں سقوط قلات کے بعد انگریزوں نے اس خطے کی عملداری اپنے ہاتھ میں لے لی۔ بلوچستان پر قبضہ کرنا انگریزوں کے لئے اس لئے ضروری تھا کیونکہ انہیں شمال کی طرف سے روس اور مغرب کی جانب سے جرمنی اور فرانس سے خطرہ تھا کہ کہیں وہ برطانوی ہندی مقبوضات پر قبضہ نہ جمالیں۔

بلوچستان پر انگریزی قبضے کا مقصد صرف اور صرف فوجی تھا۔ پنجاب پران کے قبضے کا مقصد فوجی سے زیادہ معاشی اہمیت کا تھا۔ پنجاب کی سرزمین سرسبز و شاداب اور زرخیز ہے وہاں بہت سارے دریا بہتے ہیں وہاں دنیا کا بہترین نظام آبپاشی موجود ہے اور زرعی لحاظ سے پنجاب کا خطہ دنیا کے چند مشہور و معروف زرعی علاقوں میں سے ایک ہے۔ اسی لئے انگریزوں نے پنجاب پر اپنے قبضے کے دوران وہاں پر علم و فن کو فروغ دیا بڑے بڑے تعلیمی، فنی اور تربیتی ادارے اور مراکز قائم کئے جن میں تعلیم یافتہ اور ہنر مند افراد کے کھیپ تیار ہونے لگے۔ لوگوں میں علمی اور معاشی انقلاب برپا ہوا۔ نہری نظام نے مزید ترقی کی لوگ جدید علوم و فنون سے آشنا ہوتے گئے لوگوں میں سیاسی، ثقافتی اور سماجی شعور بیدار ہوا۔ انگریزوں نے وہاں کا مال لوٹنے کیلئے پنجاب کو خوب ترقی دی وہاں بڑے بڑے شہر بسنے لگے سڑکوں اور ریلوے کا جال بچھایا گیا رسل و رسائل نے خوب ترقی کی اس لئے وہاں سماجی و معاشی ارتقاء تیزی سے ہونے لگی۔ جبکہ بلوچستان اپنے محل وقوع اور طبعی خدوخال کی وجہ سے زمانہ قدیم سے ایک اہم اور مشہور فوجی علاقے کے طور پر اہمیت کا حامل تھا (اب معدنیات کی دریافت اور سمندر نے اسکی اہمیت میں معیشت کا عنصر بھی شامل کیا ہے) لہٰذا انگریزی قبضے کا مقصد صرف فوجی نقطہ نگاہ سے تھا جہاں سے بیک وقت ہندوستان، افغانستان، وسط ایشیاء، عرب ممالک، ایران اور مشرق وسطیٰ پر نظر رکھی جاسکتی ہے۔ یہ ہمیشہ سے عالمی طاقتوں کیلئے اہم ترین علاقہ رہا ہے۔ یہاں سمندر اور خشکی ہر دو اطراف سے دونوں بالاخطوں پر نظر رکھی جاسکتی ہے۔

ماضی میں بلوچستان کی جو اہمیت تھی 18ویں، 19ویں اور 20ویں صدی میں اس کی ضرورت کئی گنا زیادہ محسوس کی گئی۔ انقلاب فرانس 1789ء کے برپا ہوتے ہی نہ صرف یورپ بلکہ پوری دنیا میں عظیم تبدیلیاں محسوس ہونے لگیں۔ دنیا ایک زبردست سیاسی اور جغرافیائی تبدیلی سے دوچار ہوا۔ 18ویں صدی صحیح معنوں میں انسانوں کے جمہوری و قومی شعوری بیداری کی صدی ثابت ہوئی۔ امریکہ میں گوروں کا مکمل قبضہ اور جمہوریت کا آغاز 1776ء میں ہوا، برطانیہ اور بعد ازاں پورے یورپ میں صنعتی انقلاب 1778ء میں آیا۔ عظیم فرانسیسی انقلاب 1789ء میں رونما ہوا۔ اور انقلابی اور شعوری ادب کی اشاعت (روسو، مارکس، اینگلز، والٹیئر، گوئٹے، شیلے وغیرہ) اسی صدی کی پیداوار ہیں۔

جہاں یورپ میں اس طرح کی عظیم تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں اسی طرح براعظم ایشیاء میں بھی قومی اور انقلابی شعور پروان چڑھ رہا تھا۔ ہندوستان پر مغلوں کا اقتدار بڑی تیزی کے ساتھ زوال پزیر تھا۔ اور وہاں پر نئی معاشی منڈیوں کی تلاش میں سرگردان انگریزی، فرانسیسی اور پرتگیزی تاجروں کا قبضہ ہوتا جا رہا تھا۔ مسلمان شہنشاہوں کے خلاف ان کے اپنے اعمال و کردار کی وجہ سے بیرونی اور اندرونی طور پر مضبوط مخالف قوتیں جنم لے رہی تھیں جن میں مرہٹہ زیادہ سرگرم تھے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مرہٹوں نے انگریزوں کے ایما اور امداد سے دہلی پر قبضہ بھی کر لیا۔ مگر 1761ء میں نئے افغان حکمران احمد شاہ ابدالی نے اپنے اتحادیوں بلوچستان کے حاکم نصیر خان بلوچ اور روہیل کنڈ کے سردار نجیب والدولہ اور دیگر کی مدد سے پانی پت کی تیسری لڑائی میں عبرتناک شکست دے کر ان کا زور توڑ دیا مگر مغلوں کے زوال کو احمد شاہ ابدالی بھی نہیں بچا سکا۔ جنوبی ہندوستان کی مسلمان ریاست میسور اور بنگال کی ریاست پر اس دوران انگریزوں نے اپنا قبضہ مکمل کر لیا تھا اب ان کے ارادے مزید آگے بڑھنے کے تھے۔

روسی عزائم بھی کسی سے پوشیدہ نہ تھے۔ ہندوستان کے وسائل سے کوئی بھی ملک یا سلطنت بے خبر نہیں تھا۔ یہ خطہ سونے کی چڑیا کہلاتی تھی۔ لہٰذا ہر سامراجی توسیع پسند اور مسخ ملک کی خواہش تھی کہ ہندوستان کی تجارتی و معاشی منڈی اس کے قبضے میں رہے۔ لہٰذا روس بھی افغانستان اور بلوچستان کے راستے ہندوستان پر کنٹرول حاصل کرنے کا خواہشمند تھا اس مقصد کی خاطر روس بلوچستان کے گرم سمندروں پر قبضے کو اولیت دیتا تھا اور برطانیہ روس کے ان عزائم سے بے خبر نہیں تھا۔

نپولین کے برسر اقتدار آتے ہی فرانس نے توسیع پسندی کی پالیسی اختیار کی۔ اس نے بھی برطانیہ کی طرح ایشیاء اور افریقہ میں اپنی نو آبادیاتی نظام کو فروغ دی۔ اس کا مقصد بھی ایشیائی اور افریقی ممالک کے وسائل کو بے دردی سے لوٹنا تھا اس مقصد کی خاطر فرانس ایران کے راستے بلوچستان کے ساحلوں پر قبضہ کرنا ضروری خیال کرتا تھا۔ جرمنی کے عزائم بھی کچھ ایسے ہی تھے مگر وہ متحد نہیں تھا اور برطانیہ ان مضبوط طاقتوں کے عزائم سے بے بہرہ نہ تھا۔

1410ء میں بلوچستان میں قومی حکومت کے قیام کے بعد قمبرانی حکمرانوں کو بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کا قومی و قبائلی شیرازہ بکھرا ہوا تھا ان کی مملکت اور سرزمین دیگر سیاسی

وحدتوں اور ممالک میں منقسم تھی ان کے پاس ایسی فوجی قوت نہیں تھی کہ جس کے بل بوتے پر وہ اپنے قومی اور جغرافیائی شیرازے کو یکجا کرتے اور جس وقت بلوچ قومی وحدت میروانی قمبرانیوں کی ماتحتی میں متحد ہو رہی تھی کہ ایک اور بلوچ طائفے رند و لاشار نے پایہ تخت قلات پر حملہ کر کے اسکی اینٹ سے اینٹ بجادی اور قمبرانیوں کو شکست دیکر تخت قلات سے عارضی طور پر بے دخل کیا اور بعد ازاں یہی دو بڑے قبائل رند اور لاشار سبی و کچھی کے میدانوں میں برسوں تک ایک دوسرے کا خون بہاتے رہے۔ لہٰذا قلات سمیت کچھی اور گنداواہ پر ان کی گرفت کمزور ہوئی اور کچھ ہی عرصے میں یہ دونوں توانا اور طاقتور بلوچ قبائل اپنی ہی سرزمین سے بیدخل ہو کر سندھ و ہند اور پنجاب میں جا کر بس گئے۔ دوسری طرف قلات پر دوبارہ قمبرانیوں نے قبضہ کر کے رند حاکم کو مار ڈالا مگر ایک بار پھر قلات پر ارغونوں کا قبضہ ہوا مگر وہ بھی مختصر عرصہ بعد یہاں سے شکست کھا کر نکل گئے اور قلات ایک بار پھر میروانی قمبرانیوں کے زیر اثر آیا۔ 1666ء میں قمبرانیوں کے ہی ایک فرد میر احمد خان نے اقتدار حاصل کیا اور قلات سے باہر دیگر اقوام مثلاً باروزئی، مغل، جاٹ وغیرہ سے جنگیں لڑ کر بلوچستان کا بیشتر حصہ ان سے خالی کرا کے اپنے زیر تصرف لایا۔ یہ خان اپنے کارناموں، بہادری، جہانبانی اور دلیری کی وجہ سے خوب مشہور ہوا اور بلوچ قبائل میں خوب شہرت حاصل کی اور احمد زئی خوانین قلات کے خاندان کا جد اعلیٰ کا مقام و مرتبہ حاصل کیا۔ ابتدائی نوے سالوں میں احمد زئی خوانین بلوچ میں ایسے باجرت افراد گزرے ہیں کہ جنہوں نے مغرب میں بندر عباس سے مشرق میں ڈیرہ غازی خان (کوہ سلیمان) اور شمال میں قندھار سے جنوب میں ساحل مکران تک پورا خطہ زمین فتح کر لیا تھا مگر ان کی یہ فتح اور قبضہ نہ تو مستحکم تھا اور نہ ہی خوانین بلوچ کے ساتھ ایسی کوئی فوج تھی کہ جس کے بل بوتے پر اس قبضہ کو برقرار رکھا جا سکتا اور نہ ہی اتنے معاشی وسائل ان خوانین کے پاس تھے کہ جس کے ذریعے سیاسی سیادت کو برقرار رکھا جا سکتا۔ لیکن قندھار، ڈیرہ غازی خان، شمال اور شمال مشرقی بلوچستان، مکران، کچھی، گنداواہ اور ایرانی بلوچستان پر ان حملوں کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ بلوچوں میں قومی یکجہتی، اتحاد اور حکومت کرنے کا شعور بیدار ہوا اور ساتھ ہی پایہ تخت قلات میں موجود خوانین کا خزانہ بھی بھر گیا جس سے عوام کے فلاح و بہبود کیلئے کام کئے گئے۔ جو سب سے بڑا فائدہ ہوا وہ یہ تھا کہ تاریخ میں پہلی بار بلوچ جغرافیہ متحد ہوا جو کہ وقت اور حالات اور دنیا بھر میں ہونے والی زبردست تبدیلیوں کے مقابلے میں ضروری تھا۔

1749ء میں میر نصیر خان قلات میں برسر اقتدار آیا۔ وہ ایک انتہائی بیدار مغز خان، عظیم سیاستدان، بہادر سپاہی، نڈر جرنیل اور اعلیٰ درجے کے مدبر تھے۔ ان کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ تمام بکھرے ہوئے بلوچ قبائل کو ایک ہی قومی وحدت کی لڑی میں پرو کر انھیں ایک ہی جغرافیائی وحدت عطا کی جائے اور جس وقت نصیر خان نوری برسر اقتدار آیا اس سے کچھ عرصہ قبل میر محبت خان کے دور اقتدار میں بلوچستان نادر شاہ افشار شاہ ایران کے زیر تسلط چلا گیا تھا اور جب 1747ء میں نادر شاہ افشار شاہ ایران قتل ہوا تو احمد شاہ ابدالی نے افغانستان میں افغان اقوام کی الگ حکومت قائم کی اور اپنی دانست میں نادر شاہ افشار کا جانشین کہلانے لگا اور نادر شاہ افشار کی تمام مقبوضات کو اپنے زیر اثر سمجھا۔ لہٰذا 1758ء میں نصیر خان نوری اور احمد شاہ ابدالی کے مابین چند شدید جھڑپوں کے بعد ایک معاہدہ طے پایا جو معاہدہ قلات اور معاہدہ عدم مداخلت کے نام سے مشہور ہوا اس طرح بلوچستان کی آزاد اور خود مختار حیثیت کو افغانستان نے تسلیم کر لیا اور بلوچستان پر سے بیرونی تسلط کے اثرات اور مزید خدشات ختم ہو گئے۔

خان اعظم میر نصیر خان نوری نے بلوچستان کی سرحدوں کو وحدت اور بلوچ قوم کو یکجہتی دیکر صحیح معنوں میں عظیم حکمران ہونے کا ثبوت دیا۔ اس نے لڑاکا بلوچ قبائل سے ایک ایسا لشکر ترتیب دیا جو پل بھر میں مخالف فوج کی صفیں الٹنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ بلوچستان کی جغرافیائی وحدت کی تشکیل نو سے اسکی اہمیت میں مزید اضافہ ہوا۔ یہ وہی زمانہ تھا جب ایک طرف برطانیہ ہندوستان میں پیش قدمی کر رہا تھا اور دوسری طرف فرانس سمیت پورا یورپ انقلاب کے دہانے پر پہنچ چکا تھا اور ابھی تک جدید یورپ کے ممالک کی سرحدی حد بندی نہ ہو پائی تھی۔

نصیر خان نوری کے عہد میں بلوچستان کی تجارت کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ بندرگاہوں میں توسیع و مرمت کر کے انھیں جدت دی گئی۔ عرب ممالک، افریقہ، ایران، مشرق وسطیٰ، ہندوستان سمیت کئی دیگر ممالک کے ساتھ بلوچستان کی سمندری تجارت نے فروغ پایا۔ لوگوں میں معاشی خوشحالی اور شعوری انقلاب آیا۔ بلوچی اور فارسی علم و ادب نے خوب ترقی کی۔ اندرون ملک رسل و رسائل کو ترقی دی گئی۔ شفاخانے، مدرسے، عدالتیں اور دیگر ضروری ریاستی ادارے قائم ہوئے۔ امن عامہ کی طرف خاص توجہ دی گئی۔ قبائلی تنازعات کا پر امن طریقوں سے تصفیے کرائے گئے اور قبائلی اصلاحات نافذ کر کے قبائل کو آپس میں شیر و شکر کر دیا گیا اور بلوچستان کو عالمی سطح پر متعارف

کروایا گیا۔

نصیر خان نوری کی 45 سالہ دور اقتدار میں کسی بیرونی طاقت نے بلوچستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کی اور اگر کسی سے یہ حرکت سرزد بھی ہوئی تو اسے ایسا منہ توڑ جواب دیا گیا کہ اس نے نہ صرف گھٹنے ٹیک دیئے بلکہ آئندہ نہ آنے کا اقرار نامہ بھی لکھ کر دیا۔ 1794ء میں نصیر خان نوری کی وفات کے بعد ان کے جانشین ان کی عظیم سلطنت کی حفاظت نہ کر سکے اور آنے والے ڈیڑھ سو سالوں میں اس عظیم سلطنت کے حصے بخرے کر دیئے گئے اور اسے مختلف ممالک میں تقسیم کر دیا گیا۔ بالٹک ریاستوں اور پولینڈ کی طرح۔

1810ء میں انگریزوں نے روسی، فرانسیسی اور جرمن خطرے کے پیش نظر بلوچستان کی زبردست جغرافیائی اور عسکری پوزیشن کو دیکھتے ہوئے اپنا پہلا مشن لیفٹننٹ ہنری پوٹنگر Lt. Hunery Pottinger کی سرکردگی میں روانہ کیا۔ کیپٹن گرانٹ بھی ان کے ہمراہ تھے۔ انہوں نے بھیس بدل کر بلوچستان کے مختلف خطوں کا دورہ کیا اور یہاں سے متعلق ہر طرح کی معلومات جمع کر کے اپنے وطن واپس ہوا۔ اس کے بعد برطانوی مہمات کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔

غرضیکہ برطانیہ نے بلوچستان کی انتہائی دفاعی اور جغرافیائی اہمیت کے پیش نظر اس پر قبضہ نہ صرف ضروری تصور کیا بلکہ اسے اپنے ہندوستانی نوآبادیات کیلئے اہم ترین مورچہ بھی خیال کیا۔ وہ بلوچ قبائل کی جنگجویانہ فطرت اور جانبازی سے بخوبی آگاہ تھے۔ انہوں نے اپنی جاسوسی مہمات کے ذریعے بلوچ فطرت کا اچھی طرح مطالعہ کر لیا تھا۔

بالآخر 1839ء میں قلات پر جنرل ولشائر کی سرکردگی میں برطانوی انڈس آرمی نے حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا اور ایک خونریز معرکے کے بعد میر محراب خان، خان بلوچ اپنے سینکڑوں ساتھیوں سمیت وطن پر نثار ہو گئے۔ گو کہ ایک زبردست مزاحمتی تحریک کے بعد میر محراب خان شہید کے فرزند میر حسن خان مشہور بہ میر نصیر خان ثانی نے اپنا اقتدار دوبارہ حاصل کر بھی لیا۔ لیکن انگریز اپنا مقصد حاصل کر چکے تھے قلات پر انگریزی قبضے کا سبب پہلی اینگلو افغان جنگ 1838ء کی ناکامی تھی۔ جس میں بلوچ قبائل کی چھاپہ مار جنگوں اور افغان غازیوں کے شجاعت آمیز حملوں نے انگریزی طوفان کا رخ دوبارہ ہندوستان کی جانب پھیر دیا تھا۔ لہٰذا انگریزوں نے افغانستان سے قبل بلوچستان کو اپنے زیر تصرف لانا ضروری سمجھا اور نصیر خان ثانی سے لیکر آخری حکمران میر احمد

یار خان تک یعنی 1840ء سے لیکر 1948ء تک دو مختلف معاہدات کے تحت بلوچستان پر قابض رہا۔ حتیٰ کہ 1876ء کے معاہدہ مستونگ کے بعد تو انگریز بلوچستان میں کُلی اختیارات کا مالک بن گیا۔

بلوچستان پر قبضہ کرنے کی برطانوی ضرورت کا اندازہ کمشنر سندھ کرنل سر ولیم میری ویدر کے اس خط سے ہوسکتا ہے جو انہوں نے 19 مارچ 1877ء کو بالائی سندھ سرحد کے پولیٹیکل سپرنٹنڈنٹ کرنل فیری کے نام لکھا تھا۔ یعنی:

قومی اور جنگی نقطہ نظر سے یہ ہمارے لئے بہت نقصان دہ ثابت ہوگا۔ یہ قبائل پشاور سے سمندر تک ہمارے دوست ہیں اور ہمارے مفاد میں کام کرنے کو تیار ہیں۔ اگر ان کو دشمن بنا لیا گیا تو بیرونی حملہ آور ایران، مکران اور سیستان کی طرف سے نہایت آسانی سے برطانوی ہند پر حملہ کر سکتے ہیں اور ان کو کسی قسم کی مزاحمت پیش نہیں آئیگی۔ 7

کمشنر سندھ کرنل میری ویدر کے ان الفاظ سے ہی برطانوی خواہش آشکار ہوتی ہے کہ انھیں بلوچستان کے راستے نہ صرف ہندوستان بلکہ بلوچستان کے گرم ساحلوں پر بھی دیگر طاقتوں کے حملوں کا خوف دامن گیر تھا لہٰذا وہ تمام بلوچستان پر قبضہ ضروری خیال کرتا تھا اور یہاں سے افغانستان، اور ایران پر اپنا تسلط جما کر وسط ایشیاء تک پہنچا جاسکتا تھا لیکن خلاف توقع انگریزوں کو پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ تک بلوچستان میں وقتاً فوقتاً غیر منظم قبائلی اور قومی سطح پر جدوجہد کا سامنا کرنا پڑا اور انکی مشکلات میں اس دوران سخت اضافہ ہوا۔

1914ء میں شروع ہونے والی پہلی عالمی جنگ نے بلوچستان کی علاقائی اور جغرافیائی اہمیت مزید بڑھا دی اور برطانیہ کی اس اہم ترین فوجی چوکی اور وسیع نوآبادیات پر قبضے کے لئے روسی، جرمن، اور فرانسیسی خطرہ بڑھ گیا۔ معدنیات کی دریافت اور طویل ساحل سمندر نے بلوچستان کو سپر پاورز کیلئے موت و زیست کا مسئلہ بنا لیا۔ 1917ء میں روسی انقلاب نے دنیا میں کمیونسٹ (اشتراکی) نظریات رکھنے والے اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف برسرپیکار مظلوم قوموں کو حوصلہ عطا کیا اور ان کی تحریکات آزادی میں تیزی آگئی۔ بادشاہت کے خاتمے اور اشتراکی حکومت کے قیام سے روس میں معاشی، ذہنی اور ثقافتی انقلاب آیا اس نے جنگ عظیم سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ زارشاہی دور کے نوآبادیات اور مقبوضات کو آزادی مل گئی قوموں اور قومیتوں کو حق خود

ارادیت مل گئی تمام صنعتی یونٹ قومی تحویل میں لے لئے گئے اور مزدوروں کی حکومت اور کمیونٹی قائم کی گئی۔ اس دوران روس نے معاشی، دفاعی اور سائنسی میدانوں میں زبردست ترقی کی اور سپر طاقت بن گئی۔ اس نئی سپر پاور کی بھی خواہش تھی کہ برطانوی سامراج کی افغانستان اور وسط ایشیائی ریاستوں کی طرف بڑھتے ہوئے قدم روک دیئے جائیں اور اسے افغانستان سے دور رکھا جائے ان مذکورہ بالا علاقوں سے برطانیہ کو صرف اسی صورت میں دور رکھا جا سکتا تھا کہ وہ جنوبی سمندر یعنی بحیرہ عرب سے دور رہے اس مقصد کی خاطر روس کیلئے بھی یہ ضروری ہوگیا تھا کہ وہ بلوچستان کے گرم ساحلوں پر قبضہ حاصل کرے۔

ستمبر 1920ء میں آذربائیجان کے دارالخلافہ باکو میں دنیا کی مظلوم، محکوم قوموں اور جمہوری و اشتراکی ممالک کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی اس سے ترکی، ایران، مصر، ہندوستان، افغانستان، بلوچستان، کاشغر، چین، جاپان، کوریا، عربیہ، شام، فلسطین اور سوویت وسطی ایشیاء کے ایک ہزار آٹھ سو اکانوے (1891) نمائندوں نے حصہ لیا۔ 8 دراصل روسی انقلاب کے سرخیلوں نے باکو کانفرنس کا انعقاد ان مقاصد کیلئے کیا تھا کہ دنیا بھر کی اقوام کیلئے قومی حق خودمختاری اور بین الاقوامی جمہوری انقلاب کیلئے اپیل و کوشش کی جائیں۔ اس کانفرنس میں بلوچستان کی نمائندگی پانچ رکنی وفد کے ساتھ مصری خان کھیتران نے کی اور اس کانفرنس میں بلوچستان کا نام ایک ملک کی حیثیت سے شامل تھا۔ 9

باکو کانفرنس کے شرکاء واپس آئے اور بلوچستان میں ایک اشتراکی انقلابی تنظیم قائم کرنے کیلئے کوشش شروع کردیں مگر چونکہ بلوچستان میں کوئی صنعتی یونٹ نہیں تھا اور نہ ہی کوئی فنی ادارہ تھا جہاں مزدوروں کو متحد کیا جاسکتا اور انہیں بین الاقوامی برادری کے ساتھ ملکر عالمی انقلاب کیلئے جدوجہد کرنے پر تیار کیا جاتا۔ بلوچستان میں بیسویں صدی کے اوائل اور برطانوی دور تک محنتی مزدوروں کا نام ونشان تک نہ تھا البتہ کچھی، سراوان جھالاوان میں بڑی بڑی جاگیرداریاں تھیں کچھ قبائلی زمینیں تھی۔ پانی کی کمیابی کیوجہ سے عام قبائلی اپنی زمینوں کو سیراب نہیں کرسکتا تھا اور جہاں پانی کے ذخائر تھے تو ان پر قبائلی سرداروں اور طاقتور جاگیرداروں کا قبضہ تھا اور عام قبائلی کی حیثیت ایک غلام کی سی تھی اور وہ بیگار پر سرداروں اور جاگیرداروں کی زمینوں پر کام کرتا تھا اور اسے اسکی محنت کے صلے میں کچھ بھی نہیں ملتا تھا۔ بلوچستان پر انگریزوں کی طاقتور حکومت قائم تھی

اورقلات سمیت پورابلوچستان ان کے زیر کنٹرول تھا۔ سرداروں اور خان بلوچ پرانھیں مکمل اختیار حاصل تھااور وہ بھی انگریزوں کے وفادار تھے۔ برطانوی حکومت نے میر محمود خان، خان بلوچ کو میری ءِ قلات تک محدود کر کے سارے اختیارات سر شمس شاہ وزیر اعظم قلات کے سپرد کر دیا تھا جسکے مظالم کی داستانیں آج بھی سنائی جاتی ہیں۔ لہٰذاان نامساعد حالات میں بلوچستان میں قومی نظریات کی پرچار کرنے کی بجائے کمیونسٹ نظریات کی پرچار کرنا بے معنی سی بات تھی جہاں سرے سے مزدور ہی نہ ہوں وہاں مزدوروں کو متحد کیسے کیا جا سکتا ہے اور جہاں کسی ملک یا خطے کی تعلیمی حالت صفر ہواور سیاسی شعور نہ ہونے کے برابر ہو جہاں ایک سامراجی نظام قائم ہو جہاں کے لوگ اپنے آس پاس اور اوس پڑوس سے بھی ناواقف ہوں بھلاانھیں کیسے فوراً کسی بین الاقوامی انقلاب کیلئے منظم کیا جا سکتا تھا حالانکہ بلوچستان اور بلوچ قوم کے حالات کے پیش نظر لینن نے بلوچستان کی مدد کرنے کی بھی تلقین کی تھی۔ شاہ محمد مری روزنامہ انتخاب حبّ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

"بلوچستان کے عوام کی آزادی کی تحریک کیلئے جناب لینن ذاتی طور پر حمایت و ہمدردی رکھتے تھے"۔10

کامریڈ لینن نے کابل میں اپنے نئے سفیر کیلئے جو ہدایات ارسال کی تھیں ان میں اسے کہا گیا تھا کہ اسے ہندوستان کی تحریک آزادی اور بلوچوں کی برطانوی سامراج کے خلاف قومی آزادی کی جدوجہد کی ہر طرح سے امداد کرنی چاہیے یہ ہدایات اس اولین خط کے ذریعے کی گئی جو کابل میں روسی سفیر کی تقرری پہ 1919ء میں لینن نے انکو بھیجا تھا۔ اور ان خطوں میں شعور وآگہی اور کمیونسٹ (اشتراکی) نظریات کی پرچار کیلئے کمیونسٹ لٹریچر کو فارسی، اردو، ترکی، آرمینیائی، پشتو، اور بلوچی وغیرہ زبانوں میں ترجمہ کر کے اسے عام کرنے کیلئے کمیٹیاں بنائی گئیں تاکہ متعلقہ اقوام کو ان کی اپنی زبان میں روسی اشتراکی ادب پڑھا کر عالمی انقلاب کیلئے ابھارا جا سکے۔

قبل ازیں افغانستان کی دوسری لڑائی 1878ء میں بھی برطانیہ نے بڑی بے دردی کے ساتھ بلوچستان کو استعمال کیا تھا اور پہلی جنگ عظیم کے دوران تو پورے بلوچستان میں انگریزوں کے خلاف کئی مسلح محاذ کھل گئے تھے مغربی بلوچستان کے قبائل کو جرمنی اور ترکی برطانیہ کے خلاف لڑنے کیلئے فوجی امداد دے رہے تھے اس طرح پہلی جنگ عظیم کے دوران بلوچستان عالمی طاقتوں کیلئے ایک اہم محاذ بن چکا تھا۔ بڑی طاقتوں کی دلچسپی کے بارے میں عنایت اللہ بلوچ لکھتا ہے کہ

"The strategic importance of Balochistan negative effect on Baloch Nationalism Because of its strategic location in the Perso- Oman Gulf with a 700 miles long sea coast. The area has been important to the trade of the west since the rise of imperialism. Its strategic impoitnace provides an opportunity to the Baloch Nationalists to deal with big or super Powers in order to liberate the country during great game, the major reason for the occupation of Balochistan by Britian was to check the advance of the Russians towords the Baloch Coast in the Arabian Sea. During the two world wars. Britian did not share the occupation of western Balochistan with the Russians, because of the fear of the russians access to warm water."

روسی عزائم بھی کسی سے پوشیدہ نہیں تھے وہ افغانستان کی سرحدوں پر موجود تھا ور برطانیہ ہی کی طرح بلوچستان پر قبضہ کرنا ضروری خیال کرتا تھا روسی عزائم کے بارے میں ایک مورخ لکھتا ہے کہ:

Towards the middle of 19th Century the Russians had annexed or subjugate the Muslim Khanates of Central Asia. The next move appeared to be towards Afghanistan and Balochistan so as to have access to the Warm waters of the Arabian Sea. the Brithish were no banks of the Ganges of Indus. The foresaw a show down with Russians, either the deserts of central Asia on the other of the oxus River or on the two high lands formed by Afghanistan and Balochistan. These

two Amirat and Khanate stood like big venetian fortresses guarding the Indus. Afghanistan-cum-Balochisatan was the chess- board on which was played the "Big Game" between two eupropean powers for supermacy in Asia Both were masters of the Game. 12

دوسری جنگ عظیم نو آبادیات کیلئے آزادی کی نوید ثابت ہوئی۔ بڑی طاقتیں آپس میں ٹکرا کر اس حد تک کمزور ہو گئے کہ ان کیلئے اب نو آبادیات پر قبضہ برقرار رکھنا ناممکن ہو گیا تھا۔ لہٰذا دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر برصغیر، پاک و ہند میں تقسیم ہوا۔ اسی طرح بلوچستان کو بھی آزادی ملی لیکن پاکستان کے نوزائیدہ مملکت کے اختیار دار یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ایشیاء کے نقشے پر بلوچستان کی سیاسی فوجی اور جغرافیائی محل وقوع کس نوعیت کی ہے؟ اور مشرق میں سندھ سے مغرب میں ایرانی صحرا تک پھیلے ہوئے اس قبائلی اور قومی خطے کی کتنی اہمیت ہے۔ مارچ 1948ء میں پاکستان نے مختلف حیلوں، بہانوں، مذہبی، لالچ اور جبر اہر طرح سے آخر کار بلوچستان پر اپنا قبضہ مکمل کر لیا۔

حوالہ جات

1. ڈاکٹر شاہ محمد مری، بلوچ قوم قدیم عہد سے عصر حاضر تک، تخلیقات، لاہور، 2000ء، 48
2. میر احمد یار خان، تاریخ خوانین بلوچ، اسلامیہ پریس، کوئٹہ، 1974، 3
3. نورا کینہ قاضی، سائرس اعظم، شاہکار فاؤنڈیشن، کراچی، سال اشاعت ندارد، 112
4. گورنمنٹ ریکارڈ، بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹیئر، مکران، گوشہ ادب، کوئٹہ، 1997، ری پرنٹ، 63
5. ایضاً، 63
6. گورنمنٹ ریکارڈ، امپیریل گزیٹیئر پراونشل سیریز، بلوچستان، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، 2002، 12
7. گورنمنٹ ریکارڈ، قلات افیئرز، گوشہ ادب، کوئٹہ، 1977، ری پرنٹ، 13
8. عنایت اللہ بلوچ، دی پرابلم آف بلوچستان، اے کیس سٹڈی آف بلوچ نیشنلزم، جی ایم بی ایچ، سٹٹ گرٹ، جرمنی، 1987، 148
9. ایضاً، 148
10. ڈاکٹر شاہ محمد مری، 268
11. عنایت اللہ بلوچ، 27
12. سید اقبال احمد، (لیفٹیننٹ کرنل) بلوچستان، اٹس سٹریٹجک امپورٹنس، رائل بک کمپنی، کراچی، 1992، 71

کتابیات

1 آزاد، ابوالکلام، مولانا، اصحاب کہف اور یاجوج ماجوج، مکتبہ جمال، لاہور، 2012ء

2 ابن خلدون، عبدالرحمان، تاریخ ابن خلدون جلد ششم، نفیس اکیڈمی، کراچی، 1971ء

3 ابن سعد، محمد، علامہ، طبقات ابن سعد، مترجم: علامہ عبداللہ العماری، نفیس اکیڈمی، کراچی، 1983ء

4 احمد یار خان، میر، بلوچ قوم کے نام، خان بلوچ کا پیغام، عباسی پریس، کراچی، 1972ء

5 احمد یار خان، میر، تاریخ خوانین بلوچ، اسلامیہ پریس، کوئٹہ، 1974ء

6 اقبال احمد، سید، بلوچستان: اٹس سٹریٹیجک امپورٹنس، رائل بک کمپنی، کراچی، 1992ء

7 اکمل، ضیاء الدین، قدیم تاریخ، سٹی بک پوائنٹ، کراچی، 2009ء

8 الازہری، کرم شاہ، پیر، ضیاء النبی ﷺ، جلد اول، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، 1415 ہجری

9 امجد، یحییٰ، تاریخ پاکستان (قدیم دور)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1989ء

10 بابر، ظہیر الدین محمد، تزک بابری، مترجم: رشید اختر ندوی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1999ء

11 براہوی، عزیز اللہ عزیز، ماہنامہ اولس، کوئٹہ، اسلام آباد، مارچ اپریل، 1986ء

12 بلوچ، عنایت اللہ، دی پرابلم آف گریٹر بلوچستان، اے کیس سٹڈی آف بلوچ نیشنلزم، جی ایم بی ایچ، سٹٹ گرٹ، جرمنی، 1987ء

13 بلوچ، محمد سردار خان، ہسٹری آف بلوچ ریس، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ، 1958ء

14 بلوچ، محمد سردار خان، اے لٹریری ہسٹری آف بلوچز، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ، 1977ء

15 بلوچ، فاروق، دی اوریجن آف دی ورڈ اریوکی، ان دی لائٹ آف ہسٹری، البرز، ریسرچ جرنل، براہوئی ڈیپارٹمنٹ، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ، والیم 1، 2009ء

16 بلوچ، فاروق، پاس آر بیلوس، دی انشنٹ نیم آف کوئٹہ کم قندھار، بلوچستان ریویو (جرنل)، بلوچستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ، والیم xxiii، نمبر 1، 2010ء

17 بہار، ملک الشعراء (تصحیح کنندہ)، تاریخ سیستان (اصل مصنف نامعلوم)، مطبوعہ دولتی، ایران، 1366 ہجری

18 پوٹنگر، ہنری، سفرنامہ سندھ و بلوچستان، مترجم: ایم انور رومان، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ، 1983ء

19 پکولین، م۔ک، بلوچ، مترجم، ڈاکٹر شاہ محمد مری، تخلیقات، لاہور، 2006ء

20 ٹیٹ، جی۔پی، دی کنگڈم آف افغانستان، انڈس پبلی کیشنز، کراچی، 1973ء

21 جیرج، جین فرانکوئس، ایکس کویشن رپورٹ آف مہر گڑھ فرام 1974 ٹو 1985، پاکستان ٹورازم ڈیپارٹمنٹ، گورنمنٹ آف سندھ اینڈ فرنچ ایمبیسی، کراچی، 1986ء

22 دشتی، جان محمد، ایسے آن بلوچ نیشنل سٹرگل ان پاکستان، گوشہ ادب، کوئٹہ، سال اشاعت ندار

23 دہوار، محمد سعید، تاریخ بلوچستان، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ، 1990ء

24 ریورٹی، ایچ، جی، سرزمین افغان و بلوچ، مترجم: سعید احمد خالد، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ، 1999ء

25 سبط حسن، سید، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، مکتبہ دانیال، کراچی، 2002ء گیارہواں ایڈیشن

26 سبط حسن سید، ماضی کے مزار، مکتبہ دانیال، کراچی، 2002ء تیرہواں ایڈیشن

27 سبط حسن، سید، موسیٰ سے مارکس تک، مکتبہ دانیال، کراچی 2000ء پندرہواں ایڈیشن

28 سٹرینج جی لی، جغرافیہ خلافت مشرقی، مترجم: محمد جمیل الرحمان، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1986ء

29 سراج، منہاج الدین، مولانا، ابو عمر عثمان، طبقات ناصری، مترجم: (انگریزی)، میجر ای جی ریورٹی، دی ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ، انڈیا، 1995 ری پرنٹ

30 سمتھ، ونسنٹ، اے، دی آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، 1992ء چوتھا ایڈیشن

31 سمتھ، ونسنٹ، اے، قدیم تاریخ ہند، مترجم: محمد جمیل الرحمان، تخلیقات لاہور، 2001ء

32 شاہوانی رحیم داد، مولانا (مولائی شیدائی)، تاریخ قلات، بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، 1983ء

33 شبلی نعمانی، علامہ، الفاروق، پرویز بک ڈپو، دہلی، سال اشاعت ندارد

34 صدیقی محمد اسماعیل، بریگیڈیئر، آئینہ بلوچستان، دوست پبلیکیشنز، لاہور، 2008ء

35 عزیز احمد، پروفیسر، نسل انسانی کی تاریخ، اپنا ادارہ، لاہور، 2000ء

36 عزیز الدین، پروفیسر، کیا ہم اکٹھے رہ سکتے ہیں۔ مکتبہ فکر و دانش، لاہور، 1992ء سیکنڈ ایڈیشن

37 فریدی، نور احمد، مولانا، بلوچ قوم اور اسکی تاریخ، گلگشت کالونی، ملتان، سال اشاعت ندارد

38 قاضی، نور اکینہ، سائنس اعظم، شاہکار بک فاؤنڈیشن، کراچی، سال اشاعت ندارد

39 قدوسی، اعجاز الحق، تاریخ سندھ، جلد اول، دوئم، اردو سائنس بورڈ، لاہور، 1996ء، سیکنڈ ایڈیشن

40 قرآن مجید، سورہ طلق، آیت 2، پارہ 30

41 قیصرانی، شاہین، محمد اشرف، پروفیسر، بلوچستان، تاریخ مذہب، ادارہ تدریس، کوئٹہ، 1994ء

42 کیسرانی، احمد زئی، نصیر خان، آغا، تاریخ بلوچ و بلوچستان، جلد اول، دوئم، بلوچی

اکیڈمی، کوئٹہ، 1982ء

43 کنڈر مین، اٹلس آف ورلڈ ہسٹری، پینگوئین، نیویارک، امریکہ، 1986ء

44 کوسمبی، ڈی ڈی، قدیم ہندوستان، تہذیب و ثقافت، بک ہوم، لاہور، 2012ء

45 گورنمنٹ ریکارڈ، بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹیئر، "مکران"، گوشہ ادب، کوئٹہ، 1997ء ری پرنٹ

46 گورنمنٹ ریکارڈ، سندھ نگر، مترجم، ایم انور رومان، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ، 1989ء

47 لہڑی، صالح محمد، ملک، بلوچستان ون یونٹ سے پہلے، ہفتہ وار باغ و بہار، کوئٹہ، 1952ء

48 محمد مجیب، دنیا کی قدیم تاریخ، سٹی بک پوائنٹ، کراچی، 2005ء

49 مری، خدا بخش، جسٹس، بلوچستان، تاریخ کے آئینے میں، مترجم: سید احمد رفیق، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ، 1989ء، تیسرا ایڈیشن

50 مری، خدا بخش، جسٹس، سرچ لائٹس آن بلوچز اینڈ بلوچستان، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ، 1985ء، تیسرا ایڈیشن

51 مری، شاہ محمد، ڈاکٹر، بلوچ قوم قدیم عہد سے عصر حاضر تک، تخلیقات، لاہور، 2000ء

52 مری، منیر احمد، بلوچستان سیاسی کشمکش، مضمرات و رجحانات، گوشہ ادب، کوئٹہ، 1989ء

53 ملک، عبداللہ، تاریخ اسلام، قریشی برادرز، لاہور، 2011ء

54 ملک، مظفر حسن، ڈاکٹر، لسانیات پاکستان، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 2003ء

55 میک کرنڈل، جارج، انویژن آف انڈیا بائے الیگزینڈر دی گریٹ، انڈس پبلی کیشنز، کراچی، 1984ء

56 میمن، نصیر، آئل اینڈ گیس ریسورسز اینڈ رائٹس آف پروونس، سی پی سی ایف، 2010ء

57 نصیر گل خان، میر، کوچ و بلوچ، گوشہ ادب، کوئٹہ، 1999ء

58 نصیر گل خان، میر، تاریخ بلوچستان، قلات پبلشرز، کوئٹہ، 2000ء

59 ویلر، مورٹیمر، سر، انڈس سویلائزیشن، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1997ء

60 ویلر، مورٹیمر، سر، وادی سندھ کی تہذیب، مترجم: زبیر رضوی، بک ہوم، لاہور، 2003ء

61 ہاشمی، ظہور شاہ، سید، بلوچی زبان وادب کی تاریخ، ایک جائزہ، سید ہاشمی، اکیڈمی، کراچی، 1986ء

62 ہیرلڈلیم، سکندر اعظم، مترجم، مولانا غلام رسول مہر، فکشن ہاؤس، لاہور، 2006ء، سیکنڈ ایڈیشن

63 ہیروڈوٹس، دنیا کی قدیم ترین تاریخ، مترجم: یاسر جواد، نگارشات، لاہور، 2001ء

☆......☆......☆

فاروق بلوچ 7 دسمبر 1967ء میں کوئٹہ میں پیدا ہوئے جبکہ آبائی طور پر ان کا تعلق بلوچستان کے ضلع مستونگ سے ہے۔ تمام تر تعلیم کوئٹہ سے حاصل کی۔ 93-1992ء میں تاریخ کے مضمون میں ماسٹر کرنے کے بعد جامعہ بلوچستان کے شعبہ تاریخ میں بحیثیت لیکچرار تعینات ہوئے اور درس و تدریس سے منسلک ہو گئے۔ تاریخ بلوچستان ان کا مرکزِ تحقیق ہے اور وہ 1995ء سے بلوچستان کی قدیم سیاسی اور نسلی تاریخ پر تحقیق کر رہے ہیں۔ جبکہ پانچ سال وہ جامعہ بلوچستان کے مرکزِ مطالعہ پاکستان میں درس و تدریس کی خدمات سرانجام دے چکے ہیں۔ 2005ء میں وہ بلوچستان اسٹڈی سنٹر میں بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر خدمات سرانجام دینے لگے اور تادمِ تحریر اسی مرکز سے منسلک ہیں۔ 2007ء میں انہوں نے تاریخ بلوچستان میں ہی ایم فل کیا۔ ان کے کئی مضامین بلوچستان کے مختلف موضوعات پر مختلف جرنلز میں چھپ چکے ہیں جبکہ بلوچستان اسٹڈی سنٹر، جامعہ بلوچستان کے لئے کئی تحقیقی پروجیکٹ مکمل کر چکے ہیں۔ ان کا ایک کتابچہ، میر یوسف علی خان عزیز مگسی اور ایک، بعنوانِ، مہر گڑھ اور ایشیاء میں اس کی اہمیت، اس سے قبل بلوچستان سٹڈی سنٹر کی جانب سے چھپ چکے ہیں جبکہ خانِ اعظم میر نصیر خان نوری، حکومت و سیاست اور شخصیت و کردار، کے عنوان سے ایک کتاب 2012ء میں فکشن ہاؤس، لاہور کی جانب سے شائع ہو چکی ہے۔ یہ ان کی دوسری کتاب ہے کہ جس میں انتہائی عمیق اور دقیق انداز میں بلوچ قوم اور ان کے حقیقی وطن کا تاریخی و تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔

لاہور • حیدر آباد • کراچی •

e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com